...انعمت علیہم

ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خان

۱۹۹۶ء

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

عباد الرحمٰن

مقدمہ

یا اللہ ! تیرے چند نیک بندوں کا تذکرہ کرتا ہوں اس امید پر
کہ مجھ سیاہ کار کی بھی بخشش ہو جائے ۔

شنیدم کہ در روز امید و بیم
بداں را بہ نیکاں ببخشد کریم

فہرست

(الف) علماء :-

(ب) زعماء :-

(ج) ادباء :-

(د) اقرباء :-

۱

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

يَا أَسَفَىٰ عَلَىٰ يُوسُفَ وَابْيَضَّتْ عَيْنَاهُ مِنَ الْحُزْنِ (ی)

حضرت مولانا محمد یوسف بنوری علیہ الرحمہ سے اس عاجز کو سب سے پہلے ۱۹۵۳ء میں حج کے دوران مدینہ منورہ میں شرفِ نیاز حاصل ہوا تھا۔ اُس وقت ان کی رفاقت میں افریقہ کے بزرگ حاجی عبدالرحمٰن مرحوم تھے اور حضرت مولانا ہی کی وجہ سے اُن کی شفقتیں بھی مجھے حاصل رہیں۔ حج کے بعد حضرت مولانا فوراً نیو ٹاؤن پر (۱۰۲ پیر الٰہی بخش کالونی، کراچی) تشریف لاتے رہے اور اپنے ساتھ مجھے بھی مختلف مقامات پہ لے جاتے تھے، بالخصوص حاجی وجیہ الدین صاحب مرحوم کے دولت کدے پہ حاضری ہوتی تھی۔ پھر جب مدرسۃ العربیۃ الاسلامیہ کے قیام کا ارادہ ہوا تو حضرت مولانا نے ازراہِ شفقت مجھے بھی استخارہ کرنے کی سعادت بخشی۔ پھر میں حیدرآباد آگیا، لیکن حج کے کئی سفر اُن کی ہمرکابی میں نصیب ہوئے۔ حضرت مولانا کو علمی مسائل سے بھی خاص تعلق رہتا، لیکن صرف اسی حد تک جہاں تک کہ دین ان سے متاثر ہوتا تھا۔ چنانچہ مجھے کبھی کبھی حیدرآباد سے کراچی بھی طلب فرمایا ہے۔ ایک مرتبہ یوں بھی شفقت فرمائی کہ اب تم حیدرآباد چھوڑ کر ہمارے پاس آجاؤ اور آسن پکڑ جاؤ۔ پھر جب ہمارے ملک میں لسانی ہنگامے کرائے گئے اور بعض علما نے بیان تک فرمایا کہ شمال سے آنے والوں کو رہنا چاہیے کہ جو کچھ انھوں نے بیان کیا ہے وہ سب مقامی حضرات کو دے دیں تو حضرت مولانا کو بہت قلق ہوا اور وہ کراچی سے حیدرآباد تشریف لائے، مجھے بھی طلب فرمایا اور ارشاد فرمایا کہ اس فتنے کو روکنے کے لیے تمہارا کیا مشورہ ہے؟ حضرت مولانا کو چونکہ اپنے جدِ امجد حضرت آدم بنوری رحمۃ اللہ علیہ کے سلسلۂ نقشبندیہ سے بھی وابستگی تھی اس لیے حضرت مجدد الفِ ثانی شیخ احمد فاروقی سرہندی قدس سرہ کے عرسِ مبارک پر ان کو دعوت دی جاتی تھی۔ ۱۹۷۶ء کے عرسِ مبارک پر انھوں نے تقریر بھی فرمائی تھی لیکن پھر دوسرے سال انھوں نے معذرت فرمائی اور یہ گرامی نامہ لکھا:

۵

بسم اللہ الرحمن الرحیم

۱۳-۲-۱۳۹۷ھ
۱۳-۲-۱۹۷۷ء

گرامی قدر محترم حضرت ڈاکٹر غلام مصطفیٰ صاحب زید مجدہم

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

مجھے اس دفعہ آپ کی بابرکت مجلس میں حاضر نہ ہوسکنے کا افسوس ہے۔ کچھ ہفتوں سے اتوار کے روز کو دماغی توازن کو صحیح رکھنے کے لیے گوشۂ تنہائی میں گزارنے کا ارادہ کرلیا ہے۔ آج اتفاق سے ۱۱-۱۲ بجے تک کا وقت ایک جگہ مدرسہ و مسجد کی بنیاد رکھنے کے لیے گلشن اقبال میں دیا تھا۔ جو مکان گوشۂ تنہائی کے لیے تجویز کیا ہے وہ وہاں سے ایک میل کے فاصلے پر ہے اور وہاں انتظار رہتا ہے۔ ٹیلیفون بھی نہیں۔ در اصل بزرگوں کی "تجدید ذکری" کے لیے تاریخ کا تعین میرے مسلکی ذوق کے خلاف بھی ہے۔ مجھے امید ہے کہ آپ میری ان معذوریوں کی وجہ سے معاف فرماکر ممنون فرمائیں گے۔ ولکم الشکر الجزیل

والسلام

محمد یوسف بنوری عفا اللہ

حضرت مولانا کی وفات حسرت آیات کی ایک تاریخ تو ازہی سورۂ یوسف سے ... نکلی ہے اور اس قطعۂ تاریخ میں بھی ایک مصرع ہجری اور دوسرا عیسوی (کامل الاعداد) عرض کیا ہے:

آہ بگذشت شہیر عالم — علم دیں را فتادہ جست شباب
فخر علماء و نازش عرفاء — فرد یکتا فلک قوم را چو سحاب
"جان خلد است محمد یوسف" — "عزت فضل، ماہ عالمتاب"
۱۳۹۷ھ — ۱۹۷۷ء

مولانا راشد برہان پوری

مولانا سید محمد مطیع اللہ راشد، برہان پور (سی۔ پی) کے ایک نامور استاد تھے۔ سلسلۂ اجداد حضرت شیخ محمد ابن فضل اللہ (م ۱۰۲۹ھ) تک اور ننھیالی سلسلہ حضرت شیخ الاولیاء عیسیٰ جند اللہ سندھی ثم برہان پوری ([illegible] تا ۱۰۳۱ھ) تک پہنچتا ہے۔ آپ برہان پور میں ۱۳۱۵ھ / ۱۸۹۷ء میں پیدا ہوئے۔ والد سید محمد فضل اللہ وہاں اپنے سلسلۂ قادریہ کے سجادہ نشین تھے۔ جاگیردار بھی تھے۔ تایا سید محمد کریم اللہ اپنے علم و فضل کی وجہ سے بہت مقبول تھے۔ شہر کے پیرزادگان اور عمائدین اُن سے فارسی، عربی اور دینی تعلیم حاصل کرتے تھے۔ راشد صاحب نے بھی اُن سے اکتسابِ علم کیا۔ صرف و نحو، عروض و قافیہ میں خاص مہارت حاصل کی۔ فارسی کے تراجم اور فارسی تحریر و تقریر میں کامل عبور بہم پہنچایا۔ خطاطی میں منفرد اور آٹھوں خطوط کی مشق کی اور کوئی بھی خط بلا تکلف لکھ سکتے تھے۔ آپ مشکل سے ۱۸ سال کے تھے کہ والد اور تایا دونوں فوت ہو گئے۔ آپ نے اور آپ کے بڑے بھائی سید محمد احمد اللہ نے آبائی جاگیر کے جھگڑے ختم کرنے کے لیے ایثار و قربانی سے کام لیا اور اپنے کاموں میں لگ گئے۔ بڑے بھائی نے تجارت شروع کی اور راشد صاحب ایک مدرسہ طیبیہ میں معلم بن گئے۔ اضافی آمدنی کے لیے عمدہ جلد سازی اور خطاطی کا سہارا لیا، تاکہ خاندان کے غریب عزیزوں کی کفالت

ہو سکے ۔ قلمی کتابوں کا بہت بڑا ذخیرہ جمع کیا اور خطِ شکستہ کے پڑھنے کی ایسی
مشق بہم پہنچائی کہ روانی کے ساتھ مخطوطات پڑھ سکتے تھے ۔ بعض مشہور اہلِ
قلم حضرات آپ سے مستفیض ہوئے ۔ ڈاکٹر ظہیر الدین مدنی ، ڈاکٹر منظور احمد
اور ڈاکٹر شیخ فرید نے خصوصیت سے استفادہ کیا اور پی ایچ ڈی کے مقالات
میں آپ سے رہبری حاصل کی ۔ مسٹر کپاڈیا (کیوریٹر ، ویلز میوزیم ، بمبئی) اکثر
آپ سے مشورہ کیا کرتے تھے ۔ پنجاب کے وزیرِ تعلیم گوکل چند نارنگ نے جب بعض
قریب الصوت عربی حروف کی تمیز کو ختم کرنے کی کوشش کی تو آپ نے سختی سے
مخالفت کی اور کئی رسالوں میں مضامین شائع کرائے ۔ ہندوستان کی سیاسی
کش مکش کے زمانے میں متعدد نظمیں لکھیں اور مسلم لیگ کی پرزور حمایت کی ۔ لیکن
تقسیمِ ہند کے موقع پر حیدر آباد دکن کے نواب دوست محمد خان اور نواب محمد
اشرف کے اصرار پر آپ مع اہل و عیال دکن چلے گئے ۔ کچھ عرصے کے بعد سقوطِ
حیدر آباد کا سانحہ پیش آیا تو آپ مع اہل و عیال کراچی آ گئے ۔ یہاں وکیل محمد صفدر
برہان پوری ، اسافر اندوری ، قمر ناگپوری ، پروفیسر امانت علی ، پھر پیر حسام الدین
راشدی کی صحبت میں علمی اور ادبی کاموں کی طرف متوجہ ہوئے ، پیر صاحب کے اصرار
پر آپ نے ایک محققانہ کتاب "برہان پور کے سندھی اولیاء" ۱۹۵۷ء میں شائع
کی ۔ پھر حیدرآباد سے محمد عطا ٹھٹوی (گیارھویں صدی ہجری) کا فارسی دیوان جس کو بڑی عرق ریزی
سے مرتب کیا وہ وہی کر سکتے تھے ۔ قلمی دیوان بہت کرم خوردہ اور آب رسیدہ
تھا ۔ آپ نے بڑی کاوش کی اور اس دیوان کو زندگی بخشی ۔ ان دو کتابوں کے
علاوہ ایک بہت بڑا کارنامہ "تاریخ برہان پور" ہے جس کے لیے انھوں نے اس
قدر محنت کی ہے کہ تفصیل مشکل ہے ۔ برہان پور کے چپے چپے سے علمی سرمایہ
حاصل کیا ۔ مخطوطات کی تلاش اور تاریخی مقامات کی تحقیق بہت بڑا کام تھا ۔ عمارتوں

پر جوش ہو کر کتبات دہلی اور علمی تحریروں کے عکس حاصل کیے۔ مزارات اور قبروں کی تحریروں کو (جو اکثر مٹتی جاتی تھیں) محفوظ کیا اور بہت بڑا علمی سرمایہ جمع کر دیا۔ اس کتاب میں برہان پور کے ساڑھے چھ سو سال کے تاریخی واقعات ہیں۔ سلاطین، امراء، علماء، اولیاء، مشائخ وغیرہ کے حالات ہیں۔ کم و بیش ڈیڑھ سو عکسی تصاویر ہیں جن میں مساجد، مقابر، مسکوکات، مخطوطات وغیرہ کے فوٹو ہیں اور پندرہ سو صفحات پر محیط ہیں۔ پھر آقائے کاظم زادہ ایرانی کی فارسی کتاب "رہبر نژاد نو" کا اردو ترجمہ بھی آپ نے کیا ہے جو مدینہ پریس بجنور سے شائع ہوا ہے۔

آخر عمر میں بہت کمزور ہو گئے تھے۔ پہلے بھی کمزور ہی تھے۔ کراچی میں ۲۹ شوال ۱۳۹۶ھ (سہ شنبہ ۲۷۔ اپریل ۱۹۷۶ء) کو تلاوت قرآن پاک کرتے ہوئے واصل بحق ہوئے۔ آپ کے بھتیجے سید محمد حبیب اللہ نے (جو داماد بھی تھے)، آپ کے نام (مطیع اللہ) کی مناسبت سے انتقال کی یہ تاریخ نکالی تھی:-

بسم اللہ الرحیم اطیعوا اللہ و اطیعوا الرسول

۹ ۷ ۳ ۱ ۵

کراچی ایئرپورٹ کے قبرستان میں خوابیدہ ہیں۔ انا للہ و انا الیہ راجعون

ضمیمہ

(۱) سید محمد حبیب اللہ آپ کے بھتیجے اور داماد بھی تھے۔ جرمنی سے ڈپلوما معذور بچوں کی تربیت کے لیے حاصل کیا تھا اور کراچی میں معذور بچوں کے اسکول کے ہیڈ ماسٹر تھے۔ کراچی یونیورسٹی سے ایم اے (اردو)

بھی پاس کیا تھا۔ بہت مخلص تھے اور علم دوست بھی۔

(۲) مولانا سمیع اللہ راشد صاحب کے ایک شاگرد مقبول نیازی کھنڈوا (سی۔پی) میں پرائمری اسکول میں مدرس تھے۔ اس اسکول ہی کے زمانے میں انھوں نے میٹرک سے ایم اے (فارسی) تک کے امتحانات پرائیویٹ طریقے سے پاس کیے۔ راقم الحروف جب ناگ پور یونی ورسٹی میں صدر شعبۂ اردو ہوا تو نیازی صاحب سے بارہا کہا کہ کسی پرائیویٹ کالج میں تقرر ہو سکتا ہے۔ لیکن انھوں نے اپنی بے نیازی کی وجہ سے پسند نہیں کیا۔ فرماتے تھے "اگر میں گورنر بھی ہو جاؤں تو دو روٹیاں ہی کھا سکوں گا، اس لیے کالج میں جا کر کیا کروں گا۔" آخر انھیں کئی احباب نے مجبور کر کے بمبئی کے صابو صدیق ہائی اسکول میں ہیڈ ماسٹر بنوا دیا۔ وہ فرماتے تھے کہ ایم اے (فارسی) کے ایک پرچے میں سوانح عمری بھی داخل نصاب تھی۔ مولانا راشد صاحب مجھے یہ کتاب اس روانی کے ساتھ سمجھاتے تھے کہ گویا انھیں وہ حفظ تھی۔ مقبول نیازی (بے نیازی) کی ایک پُرلطف کتاب "برگ سبز" بمبئی سے شائع ہوئی ہے۔

(۳) مقبول نیازی کھنڈوا میں تھے۔ انھی کے ساتھ مولانا راشد صاحب سے ملنے کے لیے راقم الحروف برہان پور گیا تھا۔ وہاں اُن کے مکان کے سامنے ایک باغ تھا جس میں شاہ جہاں بادشاہ کی بیگم ممتاز محل کو پہلے دفن کیا گیا تھا۔ پھر تاج محل (آگرہ) کی تعمیر کے بعد اُن کی نعش کو وہاں منتقل کیا گیا۔

(۴) مولانا راشد صاحب بہترین جلد سازی کرتے تھے۔ اسی کی ایک دکان

کراچی میں بندر روڈ والی میمن مسجد کے پاس کھولی تھی۔ مخدومی ڈاکٹر مولوی محمد شفیع مرحوم (لاہوری) کو ایک مرتبہ یہ عاجز اُس دکان پر لے گیا تھا۔ وہاں مولانا کے بکثرت مخطوطات تھے۔ ڈاکٹر صاحب موصوف نے بہت اشتیاق کے ساتھ دیکھے۔ بعد میں یہ مخطوطات سندھ یونی ورسٹی نے اپنی لائبریری کے لیے خرید لیے تھے۔

(۵) مولانا راشد صاحب ایک واقعہ حضرت محمد ہاشم کشمی رحمۃ اللہ علیہ کے متعلق (جو حضرت مجدد الف ثانی قدس سرہ کے خلیفہ تھے) سناتے تھے کہ پہلے اُن بزرگ کا مزار برہان پور میں "باندہ رول" ندی کے قریب تھا۔ مزار کے قریب پانی آنے لگا تو اُنھوں نے شہر کی کئی مسجدوں کے اماموں کو خواب میں فرمایا کہ میرا جسم کسی اونچی جگہ پر منتقل کر دو۔ چنانچہ ایک دن مقرر ہوا۔ شہر اور اطراف کے بکثرت لوگ موجود تھے۔ اُن کی قبر کو کھولا گیا تو اُن کا جسم بالکل سلامت تھا اور ایسی خوشبو اُڑی کہ کبھی ایسی خوشبو میسر نہیں ہوئی تھی۔ بہت سے ہندو اس واقعے سے متاثر ہو کر مسلمان ہوئے۔ حضرت محمد ہاشم رحمۃ اللہ علیہ کو پھر ایک اونچے مقام پر (ایک ہائی اسکول کے قریب) دفن کیا گیا۔

(۶) مولانا شیخ محمد ابن فضل اللہ (؟ "نائب رسول اللہ") برہان پوری (م ۱۰۲۹ھ) کا "التحفۃ المرسلۃ الی النبی صلی اللہ علیہ وسلم" ۱۳۷۸ھ/۱۹۵۸ء میں کراچی سے شائع ہوا تھا۔ اس رسالے میں وحدۃ الوجود اور وحدۃ الشہود کے اختلاف کو دور کیا گیا تھا۔ اس رسالے کا فارسی ترجمہ مصنف کے خلیفہ مولانا عبدالغفور نے کیا تھا اور اردو ترجمہ خود مولانا راشد نے شامل کیا تھا۔ مولانا راشد نے

اس رسالے پہ (راقم الحروف کا) لکھا ہے کہ بظاہر اسباب یہ
آخری تحفہ معلوم ہوتا ہے۔ گر قبول افتد زہے عز و شرف
راشد برہان پوری۔ یکم محرم ۱۳۷۸ھ مطابق ۳۰ جولائی
۱۹۵۸ء

مولانا ابوالفتح صغیرالدینؒ

حضرت مولانا پروفیسر ڈاکٹر ابوالفتح صغیرالدینؒ اپنے خاندان اور احباب کے لیے باعثِ فخر تھے۔ آپ گوپی چک (ضلع پورنیہ۔ بہار) میں جہاں اُن کے والد محمد نظیرالدین (ابن امیر علی) بہ سلسلۂ ملازمت مقیم تھے ۱۱ نومبر ۱۹۲۲ء کو پیدا ہوئے۔ لیکن جلد ہی آپ کا پورا خاندان اپنے آبائی گاؤں بھنڈاری (بہار شریف۔ ضلع پٹنہ) منتقل ہو گیا۔ وہاں ابتدائی تعلیم آپ نے والد صاحب ہی سے حاصل کی جو خود بھی معلم رہ چکے تھے۔ ۱۹۳۳ء میں مدرسۂ عزیزیہ (بہار شریف) میں داخل ہوئے۔ ابتدائی درجوں میں مختلف اساتذہ کی خدمت میں رہے۔ پھر وہاں کے مختلف اساتذہ مولانا محمد ابراہیم معقولی، محدث محمد یوسف، مفسر محمد ریاض احمد، مولانا حنیف احمد اور ادیب مولانا عبداللہ مُلک (رحمہم اللہ) کے زیرِ تعلیم رہے۔

۱۹۴۳ء میں عام علومِ دینیہ وغیرہ کا امتحان دے کر عالم کی سند حاصل کی۔ وہیں آپ نے حدیث کا شعبہ اختیار کر کے ۱۹۴۵ء میں "فاضل حدیث" کی (درجۂ اوّل میں) سند حاصل کی۔ پھر بہار شریف کی درس گاہ میں عربی اور فارسی پڑھاتے رہے۔ کچھ عرصے کے لیے مدرسۂ محمدیہ اور مدرسۂ عزیزیہ میں بھی مدرس رہے۔ ساتھ ہی مؤخرالذکر مدرسے میں لائبریرین کی حیثیت سے بھی کام کرتے رہے۔

علومِ دینیہ کے ساتھ آپ نے انگریزی بھی پڑھنی شروع کی۔ چنانچہ

سنہ ۱۹۴۷ء میں آپ نے پٹنہ یونی ورسٹی سے میٹرک کے امتحان میں فرسٹ ڈویژن حاصل کیا۔ پھر ریلوے کی میل سروس یعنی R.M.S. میں ملازمت اختیار کی۔ لیکن یہ ملازمت آپ کے مزاج کے خلاف تھی اس لیے استعفیٰ دیدیا اور سنہ ۱۹۵۱ء میں والدین کے ساتھ سابقہ مشرقی پاکستان کے راستے سے کراچی آگئے۔ یہاں بھی آپ نے اپنے علمی ذوق کو قائم رکھا۔ سب سے پہلے سنہ ۱۹۵۲ء میں پنجاب یونی ورسٹی کے منشی فاضل کے امتحان میں شرکت کی اور نمایاں کامیابی حاصل کی۔ پھر سنہ ۱۹۵۵ء میں صرف انگریزی کا امتحان پاس کرکے بی اے کی ڈگری حاصل کی۔

سنہ ۱۹۵۵ء میں لینگویج ٹیچر کی حیثیت سے آپ نے گورنمنٹ ہائی اسکول جیکب لائن کراچی میں ملازمت اختیار کی اور ساتھ ہی اپنی تعلیمی سرگرمیاں جاری رکھیں۔ سنہ ۱۹۵۹ء میں ایم اے فارسی (فرسٹ ڈویژن) اور سنہ ۱۹۶۱ء میں ایم اے عربی (فرسٹ ڈویژن) پاس کیا۔

سنہ ۱۹۶۲ء میں مفتی محمد مظہر بقا صاحب سندھ یونی ورسٹی کے شعبۂ اسلامک کلچر چھوڑ کر جب کراچی یونی ورسٹی کے شعبۂ اسلامیات میں (بحیثیت اُستاد) جانے لگے تو انھوں نے شعبۂ کے صدر محترم ڈاکٹر عبدالواحد ہالے پوتہ صاحب سے عرض کرکے اپنی جگہ پر آپ کو لیکچرر مقرر کرادیا۔ پھر آپ نے سندھ یونی ورسٹی سے سنہ ۱۹۷۱ء میں محترم ڈاکٹر صاحب موصوف کی نگرانی میں پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کی۔ اور اسی شعبے میں ترقی کرکے پروفیسر کے عہدے پر فائز ہوئے اور کم و بیش دس سال تک اسی شعبے کے صدر بھی رہے۔ ۱۰ اکتوبر سنہ ۱۹۸۶ء کو ریٹائر ہوئے لیکن اپنے طور پر درس و تدریس میں مصروف رہے اور بکثرت طلبہ کو پی ایچ ڈی کرایا۔ بعض تو عربی درسیات

سے بھی نوازا اور عزیزوں، نیز پڑوسیوں کی حتی الامکان مدد فرمائی ۔

آخر عمر میں چند ماہ آپ صاحبِ فراش رہے ۔ آپ کے صاحبزادے جو ماشاءاللہ ڈاکٹر بھی ہیں انھوں نے ہر طرح علاج معالجہ کیا۔ پھر کراچی کے لیاقت نیشنل ہسپتال لے گئے ۔ لیکن وہاں دوسرے دن یعنی یکم جون ۱۹۹۶ء کو دن کے تین بجے اپنے خالقِ حقیقی سے جا ملے ۔ انا للہ و انا الیہ راجعون ۔

آپ کے پسماندگان میں محترمہ بیوہ، پانچ صاحبزادے اسمٰعیل احمد، ڈاکٹر حافظ یحییٰ، حافظ محمد مظفر، ڈاکٹر حافظ عبدالباسط، ڈاکٹر حافظ عبدالواسع ۔ اور دو صاحبزادیاں ہیں۔ آپ کے چھوٹے بھائی محترم پروفیسر ڈاکٹر ظاہر احمد ملک صاحب کراچی یونیورسٹی میں شعبۂ اسلامیات کے صدر تھے ۔ اب ریٹائر ہیں ۔

راقم الحروف سے مولانا ابوالفتح کے تعلقات ۱۹۵۵ء سے بہت مخلصانہ رہے ہیں۔ غالباً اسی سال آپ میرے پیر و مرشد حضرت مولانا شاہ زوار حسین صاحب علیہ الرحمہ (م ۱۴۰۰ھ) سے بیعت ہوئے تھے ۔ پھر جب آپ ۱۹۶۳ء میں مستقل طور پر حیدرآباد تشریف لے آئے تو یہ تعلقات روز افزوں ہوگئے۔ شعبۂ اسلامک کلچر و تقابلِ ادیان آپ کا شعبہ تھا لیکن کلاس لینے کے بعد آپ اکثر ہمارے شعبۂ اردو میں آجاتے تھے ۔ اسی لیے محترم ڈاکٹر بالی پوتہ صاحب مذاق میں فرماتے تھے کہ وہ اپنے شعبۂ اردو میں لگے ہوئے ہیں ۔ ڈاکٹر بالی پوتہ صاحب اور پروفیسر علی نواز جتوئی صاحب (صدر شعبۂ سندھی) کو ہم لوگوں سے اس قدر محبت تھی کہ ہر روز آپس میں ملاقات کیے بغیر چین نہیں آتا تھا۔ مولانا ابوالفتح صاحب کو خصوصی طور پر ہم دوگوں سے بہت تعلق رہا۔ ہنسی مذاق کے بغیر کوئی بات نہیں

ہوتی تھی۔ ڈاکٹر خان رشید، ڈاکٹر سحی احمد ہاشمی، ڈاکٹر سید نعیم ندوی (افسوس کہ سب رخصت ہو گئے) آپ کو گھیرے رہتے تھے اور سب کے سب آپ کی بذلہ سنجی سے لطف اندوز ہوتے تھے۔ ایک دن ڈاکٹر خان رشید نے کہا کہ مولانا آج آپ کو میرے اسکوٹر پر بیٹھنا پڑے گا۔ (مولانا اس وقت تک کسی اسکوٹر کی پچھلی سیٹ پر نہیں بیٹھے تھے) آپ جونہی سیٹ پر بیٹھے ڈاکٹر خان رشید نے تیزی سے اسکوٹر کو بھگایا۔ مولانا کہتے رہے کہ اسے روکنا، لیکن خان رشید اپنی حرکت سے باز نہیں آئے اور پورا راستہ بہت تیزی سے طے کرایا۔

ایک دن جام شورو سے ڈاکٹر خان رشید نے آپ کو اسکوٹر پر بٹھایا اور کوٹری کی طرف سے سنسان راستے پر روانہ ہوئے۔ جب وہاں کوئی شخص نظر نہیں آیا تو اسکوٹر کو روک کر مولانا کو اس پر سے اتارا اور چاقو نکال کر آپ سے کہا کہ "مولانا، بہت گڑبڑ کرتے ہو، اب بتاؤ کیا کرلو گے؟ تمہاری خبر لیتا ہوں" بناوٹی غصے کا اظہار کیا۔ مولانا اس غیر معمولی رویے سے پہلے تو کچھ گھبرائے، پھر دونوں قہقہے لگانے لگے۔ اس طرح کا مذاق ہمارے شعبۂ اردو میں ہوتا ہی رہتا تھا۔ سب سے زیادہ سحی احمد ہاشمی آپ کو چھیڑا کرتے تھے۔ افسوس کہ سب کے سب اللہ کو پیارے ہوئے اور ہماری محفلیں ویران ہو گئیں۔ اب تو بقول راسخ دہلوی؛

داغِ دل جل رہا ہے بے روغن
یہ طلسمی چراغ ہے کس کا!

آپ کے انتقال سے ۴-۵ دن پہلے حاضر ہوا تو نقاہت کی وجہ سے آپ کچھ نہ بول سکے۔ لیکن آنکھوں میں آنسو جاری تھے۔ میں نے کہا کہ مولانا

آپ سے میں نے وعدہ لیا تھا کہ آپ میری نمازِ جنازہ پڑھائیں گے۔ لیکن اب
آپ یہ کیا کر رہے ہیں؟
عرفیؔ نے سچ کہا ہے :-

نہ گنجد نورِ خورشیدِ ازل در ظرفِ ہر دیدہ
بہ آبِ دیدۂ مرداں نگر تا عکسِ آں بینی

راقم الحروف آپ کے احسانات کے بارے رہا ہوا ہے۔ بکثرت مواقع پر آپ سے علمی مشورہ کیا کرتا تھا۔ محمد ہاشم کشمی رحمۃ اللہ علیہ (حضرت مجدد الفِ ثانی قدس سرہ کے خلیفہ) کی زبدۃ المقامات کا اردو ترجمہ میرے ذمہ تھا اس کے ۳ رہم ابواب کا آپ ہی نے ترجمہ کیا تھا۔ پھر کسی بات پر مجھے آپ "استاذی" لکھا کرتے تھے۔ آہ، میں کچھ بھی نہ کر سکا۔

میں نے اپنی ریڈیائی تقاریر کا ایک مجموعہ آپ کے نام "معنون" کیا تو یا کیا؟ میرے چھوٹے داماد ڈاکٹر آفتاب احمد خان نے آپ کے احسانات کے اعتراف میں اپنی کتاب" اولیائے نقشبندیہؒ کی علمی خدمات" آپ کے نام "معنون" کی تھی۔ لیکن آپ کا ایک بہت بڑا احسان ہے کہ آپ نے میرے بیٹے حافظ منیر احمد خان سلمہٗ کو عربی درسیات کی کئی کتابیں لفظاً بہ لفظاً پڑھائی تھیں۔ اللہ تعالیٰ ہی اس کا اجر دے سکتا ہے!

مولانا کیا گئے کہ ہماری محفل ویران ہو گئی۔ کاش آخرت میں راقم الحروف اُن کے طفیلیوں میں شامل ہو جائے۔ آمین۔

ص، افسوس آج دنیا میں نہیں ہیں۔ وہ جن سے تھی ہماری محفل آباد
نہایت پاک طینت، پاک سیرت بغایت متقی و نخبۂ زہاد
علوم دینیہ میں تھے وہ یکتا علوم دنیوی بھی تھے بہت یاد

۱۷

معلّم، ہم محقق، ہم مدقّق
بہت ہی خوش مزاج و خوش بیاں تھے
خدا نے ہر طرح اُن کو نوازا
ہمیشہ مطمئن تھے اس جہاں میں
کلّث فتح مُبینا رمز ابو الفتح
۷ ۱ ۴ ۱ ۵

شنبہ ۱۴ ر محرم الحرام

یقیناً نازشِ اسلافِ امجاد
سبھی کے واسطے نعمت بہ ایداد
عطا کی ہے بہت ہی نیک ولاد
رہیں جنّت میں بھی وہ شاد و شاد
صغیر الدین محمد بالیقین شاد
۲ ۹ ۹ ۶

یکم جون

بڑو

علامہ آئی آئی قاضی

سنہ ۱۹۵۶ء میں سندھ یونی ورسٹی کے رجسٹرار صاحب کا خط مجھے کراچی میں ملا کہ علامہ صاحب آپ سے فلاں تاریخ کو ملنا چاہتے ہیں۔ میں حاضر ہوا تو سلام کے بعد علامہ صاحب نے فرمایا کہ "آپ کی بڑی مہربانی ہوگی جو آپ یہاں آ جائیں گے۔" میں نے عرض کیا کہ میں حاضر ہوں۔ محترم ڈاکٹر ہالیپوتہ صاحب بھی تشریف رکھتے تھے۔ تھوڑی دیر کے بعد مجھے آرڈر ملا کہ آپ کو پروفیسر اور صدر شعبۂ اردو کی جگہ (ایک اضافے کے ساتھ) دی جاتی ہے۔ میں شکریہ ادا کرنے کے بعد کراچی آیا۔ لیکن چند روز کے لیے ہندوستان جانا تھا تو وہاں سے واپسی پر یونی ورسٹی میں حاضری دی۔ اس واقعے سے چند ماہ پہلے علامہ صاحب نے مجھے یہاں کے چند نصابات تیار کرنے کے لیے طلب فرمایا تھا اور انھیں پسند فرمایا تھا۔ گویا اُسی وقت علامہ صاحب سے پہلی ملاقات کا [illegible] تھا۔

بحمد للہ جب حیدرآباد آ کر چارج لیا تو پہلے دن اور پہلی فرصت میں پروفیسر علی نواز "وفا" صاحب (صدر شعبۂ سندھی) مجھ سے ملاقات کے لیے تشریف لائے۔ اُن کی محبت اور اخلاص نے مجھے بہت متاثر کیا۔ پھر تعلقات بڑھتے گئے۔ گھر میں آنا جانا بھی شروع ہوا۔ اور اُن کا سب سے بڑا احسان یہ ہے کہ اُن کی معیت میں سندھ کے چپے چپے کے اولیائے کرام کے مزارات پر حاضری نصیب ہوئی۔ محترم ڈاکٹر عبدالواحد ہالیپوتہ صاحب، ڈاکٹر نبی بخش خاں بلوچ

صاحب، ڈاکٹر نبی بخش قاضی صاحب، ڈاکٹر محمد علی قاضی صاحب اور رضا محمد صاحب (خازن) وغیرہ سبھی نے بڑا کرم فرمایا۔ پھر وقتاً فوقتاً علامہ صاحب کے در دولت پر بھی حاضری حاصل رہی۔ بڑی شفقت فرماتے تھے بلکہ بعض اساتذہ کے تقرر کے لیے مجھے یاد فرماتے تھے۔ اُن کی شفقت ایک روحانی باپ کی طرح تھی۔ میرے بچوں کے لیے مٹھائی بھیجا کرتے تھے۔ کبھی ان کے لیے کپڑے بھی بھیجے ہیں اور عزیزوں کی حیات وممات پر پوچھنا اور تسلی دینا اُن کا عام شیوہ تھا۔

عرصے کے بعد جب یونی ورسٹی سے اُن کی وابستگی نہ رہی اور ایک صاحب کے آجانے سے مجھے بہاول پور یونی ورسٹی جانے کا خیال ہوا تو علامہ صاحب کو افسوس ہوا اور مجھے صبر کی تلقین فرمائی۔

MOTHER ELSA بھی بڑی شفقت فرماتی تھیں۔ میری موجودگی میں انھوں نے فرمایا تھا کہ حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) سب انبیاء سے افضل ہیں۔ ایک انگریزی نظم میں انھوں نے اسی طرح کا مضمون لکھا ہے۔ اُن کا انتقال ہوا تو حیدر آباد میں ٹنڈو یوسف کے قبرستان میں اُن کو دفن کیا تھا۔ ایک دن علامہ صاحب اُن کے مزار پر مجھے لے گئے تھے۔ پھر جب علامہ صاحب کا وقت قریب آیا تو مجھ سے دریافت کیا کہ قرآن پاک میں کوئی صریح آیت ایسی ہے جو خودکشی کی ممانعت میں ہو؟۔ میں نے آیتیں پڑھیں تو فرمایا کہ وہ آیتیں دوسرے سلسلے کے متعلق بھی ہو سکتی ہیں۔ پھر ایک دن فرمایا کہ پانی میں ڈوبنے والوں کو تکلیف نہیں ہوتی۔ لیکن ان اشاروں سے مجھے اُن کا مقصد معلوم نہ ہو سکا۔ اور دوسری باتیں ہوتی رہیں۔ بہرحال جب انھوں نے سفر آخرت اختیار فرمایا تو سندھ کے ایک بزرگ نے مجھ سے فرمایا کہ اُن کی نماز جنازہ

نہیں پڑھنا چاہیے۔ میں نے عرض کیا کہ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کو تحقیق کے ساتھ معلوم ہو جاتا تھا (خواہ فرشتوں کے ذریعے)۔ لیکن ہم لوگوں کو تحقیق کے ساتھ معلوم نہیں کہ یہ سانحہ کس سبب سے ہوا ہے۔ بہر حال میں نے نماز جنازہ پڑھائی اور وائس چانسلر قریشی صاحب نے MOTher elsa کے جسد کو بھی لندن یوسف سے لا کر علامہ صاحب کے پہلو میں دفن کرا دیا۔

یہ واقعہ ۱۳- اپریل کا تھا۔ میں گھر آ کر سو گیا تو ایک ایسا واقعہ رونما ہوا کہ جسے عقل تسلیم نہیں کرے گی۔ وہ یہ ہوا کہ رات کو قریب ۳ بجے علامہ صاحب تشریف لائے۔ میں گرمی کی وجہ سے صحن میں سو رہا تھا۔ مجھے جگایا اور فرمایا کہ تم نے ابھی تک تہجد کی نماز نہیں پڑھی۔ میں نے وضو کیا اور نماز شروع کی تو علامہ صاحب میرے مصلے کے قریب بیٹھے رہے۔ پھر فرمایا کہ مجھ سے غلطی ہوئی لیکن اللہ تعالیٰ بڑا رحیم و کریم ہے۔ میرا دل بہت متأثر ہوا۔ میں ان کے لیے دعا کرتا ہوں۔

علامہ صاحب اور mother elsa کے مزارات پر کتبے کے لیے فارسی میں قطعاتِ تاریخ عرض کیے تھے۔ ان کی کتابت اور حکاکی بھی کرا دی تھی۔ پھر جب اُناج غلام مصطفےٰ شاہ صاحب وائس چانسلر ہوئے تو انھوں نے اور ان کے برادرِ صاحب نے گنبد کے اندر علامہ صاحب کی پسندیدہ آیاتِ قرآنی کو کندہ کرانے کا کام محترم ڈاکٹر بالیپوتہ صاحب اور میرے سپرد کیا جو بحمد اللہ خیر و خوبی کے ساتھ مکمل ہوا۔

علامہ صاحب تقریباً تیس سال تک لندن میں رہ کر اسلام کی تبلیغ کی تھی اور عیسائیت کا ڈٹ کر مقابلہ کیا تھا۔ فرماتے تھے کہ بائبل کا کوئی ایڈیشن، قرآن پاک سے پہلے کا موجود نہیں ہے یعنی قرآن ہی کو دیکھ کر بائبل کو تیار کیا گیا ہے اور جو اُس کے ہر ایڈیشن کو پہلے کے ایڈیشن سے زیادہ مستند

کہا جاتا ہے اُس کے معنی یہ ہوئے کہ پہلے والا ایڈیشن مستند نہیں ہوا۔ یعنی وہ خود اُس کی تردید کر رہے ہیں۔

ایک دن قادیانیوں کا ذکر آیا تو فرمانے لگے کہ تم اُن کی مسجد میں جا کر ظہر کے وقت اذان دیا کرو اور وہیں نماز ادا کرو۔ اگر وہ اعتراض کریں تو اُن سے کہو کہ آپ ہماری مسجد میں آئیں اور وہاں اذان دے کر نماز ادا کریں (لیکن وہ لوگ ایسا نہیں کریں گے)۔

ایک دن فرمایا کہ شاہ عبداللطیفؒ کے رسالے میں بعض لوگوں نے الحاقی کلام شایع کیا ہے اور ثابت کرنا چاہا ہے کہ شاہ صاحب سُنّی نہیں تھے۔ یہ بات غلط سمجھو۔

کبھی کبھی راقم الحروف سے بعض ایسی باتیں بھی تنہائی میں فرماتے تھے جو القاء کی صورت میں ہوتی تھیں۔ بعض اوقات فرماتے تھے کہ جو کچھ تم کہہ رہے ہو وہ پہلے ہی میں نے نوٹ کر کے رکھا ہے۔ دیکھو فلاں کتاب میں۔

محترم قاضی احمد محمد صاحبؒ نے علّامہ کے خطوط کا ایک مجموعہ شایع کیا ہے اور مجھ حقیر کے مشورے پر اس کا نام The gems divine رکھا ہے اور مجھ حقیر کے کچھ معروضات (انگریزی میں) اس کے شروع میں شامل کیے ہیں۔

آخر میں دلی دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ علّامہ صاحب کی خطاؤں کو معاف فرمائے۔ آمین۔ ربّنا فاغفر لنا ذنوبنا وکفّر عنّا سیّئاتنا وتوفّنا مع الابرار۔

بجاہ رحمۃ للعالمین صلی اللہ علیہ وسلّم

RENDEZVOUS

Lo, an old man comes with a napkin flung
over his shoulders and walks on a pair of
stilts, but heaves sighs.

Youths appear morose and sullen, but ruffle
their hair.

Children, though with dimples smiling on their
cheeks, rush to the scene.

But a life-long companion peeps out of the
horizon, because to-day is the 13th April.

پیر الٰہی بخش مرحوم

علی گڑھ مسلم یونی ورسٹی اپنے تعلیمی معیار اور قومی بیداری کے جذبے کی وجہ سے بہت مشہور تھی۔ وہاں ہندوستان کے چپے چپے سے طلبہ آتے تھے۔ ایران، شمالی اور جنوبی افریقہ، الجزائر، برما اور سیلون وغیرہ کے طلبہ (بلکہ گرلز کالج میں طالبات بھی) پہنچتے تھے۔ وہاں بڑے بڑے علماء، ادباء، شعراء اور ہر فکر کے لیڈر بھی آتے رہتے تھے۔ مولانا محمد علی جوہر، مولانا شوکت علی، گاندھی، نہرو، مولانا ظفر علی خان، مولانا عطاء اللہ شاہ بخاری، مولانا ثناء اللہ امرتسری، مولانا سید سلیمان ندوی، علامہ اقبال، حفیظ جالندھری اور پورے ملک کے بڑے چھوٹے شعراء بھی مختلف تقاریب میں شرکت کرتے تھے۔ پہلی جنگِ عظیم کے تُرک امیر البحر رؤف بے، بلکہ کبھی افغانستان اور ایران کے حکمران بھی وہاں آتے تھے۔ وائسرائے اور گورنر، نیز ہندوستان کے نوابین بھی مدعو ہوا کرتے تھے۔ ایسی زندگی پورے برصغیر پاک و ہند میں صرف علی گڑھ میں تھی اور اسی وجہ سے یہاں کے طلبہ میں سیاسی اور قومی بیداری کا جذبہ سب سے زیادہ تھا۔

ہمارے پیر الٰہی بخش مرحوم بھی علی گڑھ کے مشہور طالب علم رہ چکے تھے۔ وہ مجھ سے چار سال آگے تھے۔ جنرل محمد ایوب خان مرحوم، مولانا نثار احمد فاتیوی اور میرے سینیئر دوست ڈاکٹر خطیب ناگپوری (نواب صدیق علی خان مرحوم کے عزیز) ان کے ہم جماعت تھے۔ جنرل محمد ایوب خان کے

بھائی سردار خان مجھ سے دو سال آگے تھے۔ ایسے بڑے اور مشہور حضرات
(مولانا حسرت موہانی، مولوی عبدالحق، نواب زادہ لیاقت علی خان وغیرہ
بکثرت لیڈر بلکہ جی ایم سیّد بھی) وہیں کی تعلیم اور ماحول کے پروردہ تھے۔

پیر الٰہی بخش بھی قومی جذبے سے سرشار تھے اور قوم کی خدمت کا عزم
لے کر علی گڑھ سے آئے تھے۔ چناں چہ مسلم لیگ کے لیے انھوں نے ہر موقع پر
بڑھ چڑھ کر حصّہ لیا اور وہ یقیناً پاکستان کے بانیوں میں شمار ہوتے تھے۔
وہ قائدِاعظم کے خاص معاونین میں سے تھے۔ انھوں نے سندھ کے گوشے
گوشے میں مسلم لیگ کے رشتے قائم کیے۔ لوگوں میں سیاسی بیداری اور یکجہتی
پیدا کی اور دامے درمے سخنے قوم کی امداد فرمائی۔ پاکستان قائم ہوا تو
قائدِاعظم نے اُن کے تعاون سے کراچی میں دارالحکومت قائم کیا۔ پیر صاحب
سندھ کے وزیرِاعلیٰ بھی تھے۔ انھوں نے بڑی کوشش سے کراچی میں
سیکریٹریٹ کی تاسیس اور تعمیر میں بھرپور حصّہ لیا۔ بندر روڈ (کراچی) پر
بہت بڑی عمارت تعمیر کروائی جس میں بڑے بڑے دفتر تھے۔ پھر وہیں سندھ
یونی ورسٹی کی انتظامیہ کے دفاتر بھی قائم ہوئے اور سندھی ادبی بورڈ بھی
وہیں قائم ہوا۔

پیر صاحب نے ۱۹۴۸ء میں ہزاروں مہاجروں کی آبادکاری کی اسکیم
تیار کی اور ایک وسیع رقبے میں اُن کے لیے کالونی قائم کی جس میں صرف ساڑھے
چھے ہزار فی کوارٹر خرچ آیا۔ پیر صاحب نے شاندار وسیع مسجد بھی بنوائی۔
بہت بڑا موٹر اسٹینڈ بنوایا۔ کالونی کی انتظامیہ کا دفتر بھی بنوایا۔ اور مسجد
کے قریب ہی اپنا مکان بنوالیا تاکہ مسجد اور مسجد والوں کی خدمت کی جا
سکے۔ ظاہر ہے کہ اس وسیع پروگرام کے لیے دوسرے حضرات کے تعاون کی

بھی ضرورت تھی لیکن اصل منصوبہ پیر صاحب ہی کا تھا اور اُنھی سے سب لوگ مشورہ لیا کرتے تھے۔

راقم الحروف بھی اسی پیر الٰہی بخش کالونی کے مکان نمبر ۱۰۲۸ میں مقیم تھا۔ نماز کے لیے مسجد میں حاضر ہوتا، تو پیر صاحب سے نیاز حاصل ہوتا تھا۔ کبھی کبھی اُن کے دولت کدے پر بھی حاضر ہوتا تھا۔ اُس وقت اُن کے صاحب زادے اور پوتے (جو ماشاءاللہ اب بہت معزز ہیں) چھوٹے چھوٹے تھے۔ پیر صاحب خوب صورت اور خوب سیرت تھے۔ ہمیشہ علی گڑھ والی تُرکی ٹوپی (سُرخ رنگ والی) پہنتے تھے تو اور بھی حسین نظر آتے تھے۔

راقم الحروف کو علامہ آئی آئی قاضی نے از راہِ کرم سندھ یونی ورسٹی میں ۱۹۵۶ء میں بُلوالیا۔ اُس وقت سے اب تک یہیں قیام ہے۔ لیکن جب کبھی کراچی حاضر ہوتا تو پیر صاحب سے نیاز حاصل کرتا تھا۔ غالباً ۱۹۶۲ء میں وہ سندھ یونی ورسٹی کے نئے کیمپس جام شورو تشریف لائے تو مجھے تلاش کرتے ہوئے شعبۂ اردو میں پہنچے۔ وہاں ایک صاحب کچھ سرپھرے بیٹھے ہوئے تھے۔ انھوں نے کوئی بات پیر صاحب سے پاکستان کے خلاف کہہ دی تو پیر صاحب کو غصّہ آگیا۔ فرمایا کہ تم کیا جانو کہ ہم نے پاکستان کس طرح بنایا ہے اور کیا کیا تکلیفیں اُٹھائی ہیں۔ پھر وہ صاحب جو سرپھرے تھے خاموش ہو گئے اور اُن سے کوئی جواب نہ بن پڑا۔

افسوس کہ پیر صاحب جیسے مخلص بزرگ اب نہیں ہیں اور جو ہیں اُنھیں پاکستان کی اصل حقیقت سے واسطہ بہت کم ہے۔

پیر صاحب کے انتقال پر راقم الحروف نے یہ قطعۂ تاریخ لکھا جو اُن کے مزار پر (مسجد کے جنوبی حصّے میں) کندہ کیا گیا ہے:-

آه بگذشت آں شہیر ملک و قوم　　آں وزیر اعلیٰ آں فخر زماں
حبِ دین و حبِ قوم و ملک داشت　　حب پاکستان و پاکستانیاں
کرد تعمیراتِ قومی را بنا　　حسن خلق و حسن سیرت را نشاں
بود ہر دم مستعد در ردِ کفر　　بود دائم حق پسند و حق نشاں
حق پسند و مخلص و ہمدردِ قوم　　پیر الٰہی بخش جنت آشیاں

۱۳۹۵ھ　　۱۹۷۵ء

سہ شنبہ یکم شوال　　۷ اکتوبر

پیر صاحب کے صاحب زادے پیر شاہ نواز کے انتقال پر یہ قطعۂ تاریخ لکھا تھا :-

آه بگذشت حضرتِ مخدوم　　مخلصِ قوم، ہم غریب نواز
از شرافت واز نجابتِ خویش　　در رئیسانِ سندھ شد ممتاز
پدرش پیر الٰہی بخش علیگ　　پرورش خیر کردہ ناز و نیاز
بود از بانیانِ پاکستان　　کرد احکامِ شرع را آغاز
ہمہ اسلافِ او سراپا قدس　　ہمہ اخلاف بہر دین بناز
ایں مکرم کہ بود فخر تمام　　با صفا، با سخا و با اعزاز
از صفا گشت داخلِ جنت　　بادئ خیر پیر شاہ نواز

۱۹۹۲ء　　۱۴۱۲ھ

سہ شنبہ ۲۸ اپریل　　۲۵ شوال

پروفیسر علی نواز جتوئی مرحوم

۱۹۵۶ء میں سندھ یونی ورسٹی کے شعبۂ اردو میں جس دن داخل ہوا تو پہلی فرصت میں پروفیسر علی نواز جتوئی (صدر شعبۂ سندھی) ملاقات کے لیے تشریف لائے اور ایسی محبت اور اخلاص سے پیش آئے کہ میں اُن کا گرویدہ ہو گیا اور اُن کی یہ محبت اُن کے آخری ایام تک روز افزوں رہی۔ اُن کے مجھ پر بڑے احسانات ہیں کہ اُن کے ساتھ مجھے سندھ کے چپے چپے کے اولیائے کرام کے مزارات پر حاضری نصیب ہوئی۔ بھٹ شاہ۔ باردچو باغ۔ بالا سیھون۔ قبۂ شریف (ٹنڈو سائیں داد)۔ بلڑی شریف۔ مُلّا قاتِ یار۔ جھرک۔ مَکلی۔ گجّو۔ پیر پٹھو۔ تاج پور نصرپور بدین۔ گرھوڑی شریف۔ میر پور خاص۔ قاضی احمد۔ مورو۔ سکّر۔ رپیاں لوٹے۔ خیرپور۔ شکارپور۔ جیکب آباد۔ رودھڑی۔ پیر جو گوٹھ۔ گڑھی مولانا حماد اللہ۔ نُواری شریف۔ لڑکانہ۔ دادو۔ پیر بلاول وغیرہ اور اُن کے قرب و جوار کے بھی بکثرت مزارات پر حاضر ہونے کی سعادت حاصل ہوئی بلکہ بعض مقامات پر کئی بار حاضری نصیب ہوئی اور سب کے لیے دعا کی سعادت بھی حاصل رہی۔ اسی طرح لاہور، راولپنڈی، پشاور، بالاکوٹ اور مظفرآباد وغیرہ میں بھی ساتھ رہا۔ شمالی پاکستان کے اس سفر میں پروفیسر منظور احمد سلیم اور برخوردار سراج احمد سلمہٗ بھی ساتھ تھے۔

جتوئی صاحب نے بعض رسالے تصوف سے متعلق بھی شائع کیے

ہیں۔ حضرت بہاء الدین نقشبند بخاری قدس سرہ کے کلماتِ قدسیہ کا اردو ترجمہ۔ آسان تصوف اور حضرت پیر ایرانی رحمۃ اللہ علیہ کی کتابیں بھی انھوں نے شایع کی ہیں۔

شعبۂ سندھی اور شعبۂ اردو ساتھ ساتھ واقع تھے تو دونوں شعبوں کے اساتذہ میں باہمی محبت بھی بہت تھی۔ ہمیشہ شعبوں کے جلسوں میں شرکت رہتی اور علمی گفتگو ہوتی رہتی تھی۔ محترم ڈاکٹر ڈاکٹر عبدالواحد ہالی پوتہ صاحب کا شعبۂ عربی اور شعبۂ تقابلِ ادیان مع اسلامیات گو کہ کچھ فاصلے پر تھا لیکن ڈاکٹر صاحب کی شفقتیں ہم سب پر ہمیشہ رہتی تھیں اور اُن کا شعبہ بھی ہمارا شعبہ کہلاتا تھا۔

جتوئی صاحب بڑے حق گو تھے۔ ایک وائس چانسلر آئے تو انھوں نے تنخواہ کے سالانہ اضافے کے لیے شرط لگا دی کہ ریسرچ کا کام دکھلانا ہوگا۔ جتوئی صاحب نے دلیری سے اُن سے بحث کی اور اس شرط کو ختم کرایا۔

جتوئی صاحب نے ایم اے کے علاوہ بی ٹی بھی پاس کیا تھا۔ غالباً شروع میں تھوڑے عرصے کے لیے کسی اسکول میں بھی مدرّس رہے تھے۔ پھر کالج میں اور ۱۹۵۵ء سے یونی ورسٹی میں اُستاد رہے۔ پنشن کے بعد ملازمت میں توسیع بھی ملی تھی۔ یونی ورسٹی کی ملازمت کے زمانے میں کچھ عرصے کے لیے لندن کا بھی علمی سفر کیا تھا۔ بعد میں ہومیو پیتھک ڈاکٹر بھی بن گئے تھے۔

اوپر عرض کیا گیا کہ اُن کو اولیائے کرامؒ سے بڑی عقیدت تھی اور سلسلۂ نقشبندیہ زیادہ پسند تھا۔ اسی لیے وہ ٹنڈو سائیں داد کے نقشبندی بزرگوں سے اپنے اسلاف کی طرح بیعت ہوئے تھے۔ پھر حضرت پیر ایرانی

علیہ الرحمہ سے بیعت ہوئے اور خلافت بھی حاصل کی۔

جتوئی صاحب بہت خوش مزاج اور خوش طبع تھے۔ میں نے عرض کیا کہ مجھے سندھی سکھا دو۔ کہنے لگے کہ کیا بڈھے طوطے بھی کچھ سیکھ سکتے ہیں؟

ایک لطیفہ اُن کی زندگی کا ایسا ہے جس کو وہ اکثر سُنایا کرتے تھے کہ میں ہمیشہ یہ دعا کرتا تھا کہ مدینہ منورہ جاؤں تو وہیں فوت ہو جاؤں۔ چنانچہ (غالباً ۱۹۵۱ء) میں حج کے لیے حاضری دی تو مدینہ منورہ میں تیز بخار آگیا اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ گویا اب وقت (فوت ہونے کا) آگیا ہے۔ تو میں نے دعا کی کہ اللہ میاں ابھی نہ مروں۔ دوبارہ جب آؤں تو مجھے یہاں موت دے دیجیے گا۔ اس کے بعد (ازراہِ دور اندیشی) دوبارہ وہاں حاضر نہ ہوا!"

یہ لطیفہ وہ ہنس ہنس کر سُناتے تھے اور ہم لوگ بھی مزے لیتے تھے۔

جتوئی صاحب کی دو شادیاں ہوئیں۔ پہلی شادی پانی پت کے ایک خاندان میں ہوئی۔ اُس شادی سے جو بچے ہوئے وہ ماشاءاللہ بڑے عہدوں پر فائز ہیں۔ بعد میں دوسری شادی ایک سندھی خاندان میں کی۔ اس شادی سے جو بچے ہیں وہ بھی بہت سعادت مند ہیں۔ اللہ تعالیٰ ان سب پر خصوصی فضل فرمائے۔ آمین۔

(جتوئی صاحب کا انتقال یکشنبہ ۲۹ ستمبر ۱۹۹۶ء ۔ ۱۶ جمادی الاول ۱۴۱۷ھ کو ہوا) اور بحمداللہ اس حقیر کو اُن کی نمازِ جنازہ پڑھانے کی سعادت حاصل ہوئی۔ انھوں نے یونی ورسٹی کو درخواست دی تھی کہ اُن کو علامہ قاضی صاحب کے قریب دفن کی اجازت دی جائے لیکن وہ درخواست کسی سبب سے منظور نہ ہوسکی۔ جتوئی صاحب کے پیر ایرانی صاحب علیہ الرحمہ کے خطبات پر انگریزی میں ایک حقیر مضمون عرض کیا تھا۔ وہ بھی یہاں شامل کرنا بے محل نہ ہوگا۔ وہ اس طرح ہے:-

٣٠

Pir-e-Irani sahib (D.1407/1986) has been a renowned preacher of Islam, who had come over from Iran to India and finally settled at Hyderabad (Sindh). He had, arround him, a large gathering of devotees, who used to get theoretical and practical lessons every evening. Thanks are due to professor Ahmed Muhammad Qazi Sahib, who has translated those lessons from Urdu into English and is now presenting them in two volumes. They contain a deep Study of the Self, its nature, its scope and its merits. How happy will be the person who (would) purify his soul with them.

But a sinner, like myself, (if and when) finds no solace and perceives a yawning gap between virtue and vice. he cries out for the divine help. Sometimes, the blessings pour down from Heaven for his blooming fate, yet he is bewildered and he asks his inner soul, "Really

Is it so"?
This question awaites a reply for a life in the Hereafter. These lectures bear fruits for that life, no doubt.

GHULAM MUSTAFA KHAN.

حافظ حکیم عبدالغفار ذوقی الٰہ آبادی

حضرت حکیم حافظ عبدالغفار ذوقی الٰہ آبادی مرحوم جامع الکمالات بزرگ تھے۔ بچپن میں قرآن پاک حفظ کیا۔ پھر اُستاذ الہند قاری ضیاء الدین احمد صاحب علیہ الرحمہ کے مدرسۂ سبحانیہ الٰہ آباد میں تجوید و قراءت کی تحصیل کی۔ پھر شاعر و ادیب بھی ہوئے لیکن علم الادیان کے ساتھ علم الابدان کا شوق غالب ہوا تو یونانی طب، نیز ہومیوپیتھی اور بائیوکیمسٹری میں مہارت حاصل تھی۔ خوش نویسی اور خطاطی (ثلث و رقاع وغیرہ) کے فن میں بہت مشق کی۔ چنانچہ نسخ اور جلی بڑی خوبی کے ساتھ لکھتے تھے۔ راقم الحروف کی متعدد کتابیں آپ نے کتابت فرمائی تھیں۔ حیدرآباد منتقل ہوئے تو حضرت پیر ایرانی علیہ الرحمہ کے فیوض و برکات سے مستفیض ہو کر اُن سے خلافت بھی حاصل کی۔ پھر خوش اخلاق، خوش اطوار اور خوش گفتار ایسے تھے کہ اُن سے ایک مرتبہ بھی ملنے والا اُنھیں فراموش نہیں کرسکتا تھا۔ خوددار ایسے کہ بڑے بڑے افسروں سے عزیزداری ہونے کے باوجود کبھی اُن سے اپنی حاجت بیان نہیں کی۔ اور کبھی اپنی تکلیف کا اظہار نہیں کیا۔ بقولِ داغ:

آپ کی جس میں ہو مرضی وہ مصیبت بہتر
آپ کی جس میں خوشی ہو وہ ملال اچھا ہے

سلیقہ اور معاملہ فہمی ایسی تھی کہ لوگ اُن سے اپنے معاشرتی معاملات

میں مشورہ لینا موجبِ خیر و فلاح سمجھتے تھے۔ قرآن پاک سے شغف ایسا تھا کہ ہر روز دور کرتے اور بڑھاپے تک محراب سُناتے رہے اور محراب سُنانے میں اتنی احتیاط ملحوظ رکھتے تھے کہ آیاتِ سجدہ کی تلاوت کے وقت اپنی تلاوت کی آواز کو پست کر لیتے تھے تاکہ دوسرے لوگ جو تراویح میں شریک نہیں ہیں وہ سجدہ کرنے کے مکلّف نہ ہونے پائیں — مذکورۂ بالا محاسن کا پرتو صراحۃً یا کنایۃً اُن کی اس آخری تصنیف "تجزیۂ حیات" میں جگہ جگہ نظر آتا ہے۔

تجزیۂ حیات کا ابتدائیہ حمد و نعت پر مشتمل ہے اور نئے انداز میں ہے۔ پھر مخلوقات کی زندگی کا تجزیہ ہے مولیدِ ثلاثہ یعنی جمادات، نباتات اور حیوانات کی زندگیوں کی چار اقسام پر بحث ہے۔ یعنی (۱) ظاہر ادنیٰ باطن ادنیٰ (۲) ظاہر اعلیٰ باطن ادنیٰ (۳) ظاہر ادنیٰ باطن اعلیٰ اور (۴) ظاہر اعلیٰ باطن اعلیٰ کی تفصیل ہے۔ اور حیوانات کی زندگی کے ذیل میں موجود مسائل کا ذکر بھی ہے۔ مثلاً مُردہ اور ذبیحہ کا فرق۔ جھٹکا اور ذبیحہ کا فرق۔ ذبیحہ پر اللہ کا نام۔ نذر و نیاز اور فاتحہ۔ ہندو قوم کا ماش کی دال کھانے کا مقصد ۔ وغیرہ۔

پھر انسانی زندگی کا ذکر ہے کہ وہ مولیدِ ثلاثہ سے کیوں افضل ہے۔ اور جنّات، ملائکہ اور ارواح سے کیوں مختلف ہے؟۔ وہ معتدل المزاج، معتدل الافعال اور معتدل النتائج کیوں ہے؟ اور اُس کی بھی چار اقسام مذکورہ کے ذیل میں اس کے مختلف فضائل اور رذائل کا تجزیہ ہے۔ اور موجودہ سائنسی دور سے متعلق ضروری مباحث کا مفصّل جائزہ ہے۔ اس کے بعد اسلام، مزاجِ اسلام، قبولِ اسلام، حقوق اللہ، توحید (اس کی

مختلف اقسام)، ایمانیات، طہارت، تزکیہ وغیرہ پر سیر حاصل بحث ہے اور انسان کی اشرف و اعلیٰ زندگی (ظاہر اعلیٰ باطن اعلیٰ) کے متعلق فرمایا ہے کہ "... زندگی اللہ تعالیٰ کی صفتِ حیات سے اس قدر قریب ہوتی ہوتی ہے کہ اسی زندگی کے حامل انسان کو خدا رسیدہ ...... وغیرہ کہتے ہیں"۔ حضرت ذوقی صاحب نے اسی زندگی کو زندگی کی معراج کہا ہے۔ موضوع کا تمام و کمال تجزیہ یہیں مکمل ہوتا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ مرحوم نے جس خوبی سے اس تجزیے کی تفصیل فرمائی ہے اور جس انداز سے اس کی تکمیل پر روشنی ڈالی ہے وہ اس دور کی مادی اور روحانی زندگی کے لیے بے حد مفید بھی ہے اور سہل الحصول بھی۔

اُن کی ولادت الہ آباد میں ۱۳۲۴ھ/۱۹۰۶ء میں ہوئی اور وفات حیدر آباد سندھ میں دوشنبہ ۱۳۹۳ھ/۱۹۷۳ء کو ہوئی۔ اللہ پاک مرحوم پر بے پایاں رحمتیں نازل فرمائے۔ آمین۔ بجاہ رحمۃ للعالمین صلی اللہ علیہ وسلم۔

راقم الحروف نے قطعۂ تاریخ اس طرح عرض کیا تھا:۔

صد افسوس آج دنیا میں نہیں وہ
کہ جن کے غم سے افسردہ سبھی ہیں
حکیم و حافظ و قاری و عالم
سب اوصاف اُن کے فخرِ زندگی ہیں
سراپا زہد و تقویٰ مثلِ اسلاف
یہ زاہد زادہ ذوقی جنتی ہیں

۱۳۹۳ھ

اب اُن کے چند مختلف اشعار ملاحظہ ہوں:۔

با جامِ شرابِ لاالٰہ، سرمست دلِ دیوانہ ہے
دیوانے کے اس پیمانے میں توحید کا وہ میخانہ ہے

وہ ہم میں نبیؐ بن کر آئے، کیا خوب یہ اُن کا آنا ہے
فرمان لقد منّ اللہ میں، احسان اُسے فرمانا ہے

تحمیدِ خدا بے نعت نہیں اور نعت نہیں بے حمدِ خدا
گر حمد کریں تو نعت ہے "یہ" اور نعت ہی شکرانہ ہے

والشمس وہی، واللیل وہی، یٰسین وہی، طٰہٰ وہ ہی
یہ ماضی و حال و مستقبل میلاد کا اُن کی بہانہ ہے

ہوا ہے ظاہر وہ نورِ اوّل جو کُن مکاں کی ترنگ ہو کر
فرشتے سجدے میں گر گئے ہیں کھڑا ہے شیطان دنگ ہو کر

بٹھا کے محراب دل میں اُن کو نثار کر دیں گے اُن پہ سجدے
صنم پرستی کریں گے کعبے میں ہم فقیر ملنگ ہو کر

ہم آتے جاتے ہیں سب سے چھُپ کر بسا ہے سینے میں یہ مدینہ
کھلا ہے رستہ ہمارے دل سے درِ نبیؐ تک سُرنگ ہو کر

یہ میرا دل ہے ہوائی کاغذ، ہے ربطِ طیبہ کی مانجھ ڈوری
خدا اُڑا دے یہاں سے مجھ کو، گروں وہاں میں پتنگ ہو کر

افسانہ بن گیا جو تجلّیِ طور کا — گوشہ سرک گیا تھا رسالت کے نور کا
تھا کس کا نور آتشِ ایمن میں اے کلیمؑ — رستہ دکھایا جس نے تجلّیِ طور کا
تھا غیب میں وہ جوشِ جمالِ محمدی — عالم میں حُسن پھوٹ پڑا ہے ظہور کا
وہ باوجودِ بندگی ہیں ربِّ کائنات — رتبہ تو دیکھئے کوئی یہ عبدِ شکور کا

کہاں ڈھونڈوں اسے ڈھونڈوں، کہاں پاؤں، کسے پاؤں
جہاں ڈھونڈوں وہیں ہوگا، جہاں ہوگا نہاں ہوگا

بندہ اگرچہ بندۂ مجبور و ناتواں ہے ___ مجبور اب نہ ہوں تو پھر بندگی کہاں ہے

ساقی نے اک جام میں یہ کیا پلا دیا ___ قطرے میں بحرِ کل کا تماشا دکھا دیا

ذوقیؔ سا [illegible] تھا اور جاں نذر تھا وہ لُٹ گئے ___ اس رحمتِ عالم کی شمشیر کا [illegible] کہا

ذوقیؔ تھا جو کسی [illegible] کے ملنے کا نام ___ وہ نقش [illegible] مٹا دیا

[illegible] کو ڈھونڈتا ہوا کیا ہی [illegible] ہو ___ [illegible]

دیکھ [illegible] جانے والے ___ اک دنیا ہے [illegible] کی

[illegible] قدم آگے ___ [illegible] میں کچھ [illegible] میری

[illegible] جلا [illegible] نہیں ہوتا ___ فانی ہوتا ہے جب دل میں کوئی [illegible] یہاں نہیں ہوتا

جانے کا [illegible] وحدت کا پتا مجھکو ___ وہ [illegible] ہوگا

[illegible] فتنۂ ذوقیؔ ___ [illegible] میں اور [illegible] میں [illegible] ہے

عجیب چیز ہے نسبت کی [illegible] بھی ___ [illegible] ہیں

[illegible] لطفِ گل ملا ذوقیؔ ___ [illegible] کیوں گل و بلبل سے [illegible] نکلتے ہیں

ہر گل ہے چاک چاک ہوئے پریشاں گل [illegible] ___ دیوانگی کا اپنی اثر دیکھتا ہوں میں

ذوقیؔ [illegible] دیوانہ اب کہاں ___ ڈھونڈیں [illegible] فرزانے بیٹھے ہوئے

اپنے کیا [illegible] ہر اک چیز کو [illegible] ___ ذوقیؔ کمال یہ ہے کہ کامل نہیں ہوں میں

کسی کو [illegible] دولت کی [illegible] دنیا میں ذوقیؔ کو ___ نہ عزت کی طلب [illegible] ذوقیؔ کو

بڑی عزت ملی ہے فقر سے [illegible] ذوقیؔ کو ___ مزاجِ خسروی حاصل ہوا استغنا سے ذوقیؔ کو

یہ ذوقیؔ تو گدا ہے خواجۂ قاسم کیانی کا

کہیں گل آذری، نوری، براہیمی، کلیمانی ___ کہیں رنگِ مسیحی اور بوئے محبوبِ یزدانی

بہارِ بے خزاں کی ہر طرف ہے فرد سامانی ___ بحمد اللہ چمن کے باغباں ہیں پیرِ ایرانی

چمن پھولا پھلا ہے خواجۂ قاسم کیانی کا

ابوالعجز ساجد علی ساجد اسدی

ولادت جے پور ۱۳۳۱ھ / ۱۹۱۱ء ۔ وفات، حیدرآباد ۱۳۹۸ھ / ۱۹۷۸ء

حضرت ساجد اسدی مرحوم مشہور اہلِ قلم تھے۔ انھوں نے نثر و نظم میں کئی بلند پایہ کتابیں یادگار چھوڑی ہیں۔ فارسی نثر و نظم میں بھی انھیں پوری مہارت حاصل تھی۔ وہ اردو کے خوش فکر اور خوش گو شاعر حضرت آفتابِ [illegible] قاضی نور احمد تنویر کے ارشد تلامذہ میں سے تھے۔

مرحوم ساجد جے پور کے ایک ایسے گھرانے کے چشم و چراغ تھے جس میں قرآن و حدیث کے چرچے عام تھے اور اُٹھتے بیٹھتے قال اللہ اور قال الرسول (صلی اللہ علیہ وسلم) کی پیاری باتیں اکثر سنائی دیتی تھیں، اور اُن کے والدین نے بچپن سے گھر کا ماحول ایسا بنا رکھا تھا جس سے اپنے پرائے سبھی مستفید ہوتے تھے اور دینی فیوض و برکات حاصل کرتے تھے۔ حضرت ساجد نے "مخزنِ نعتِ مقبول" ایسے زمانے میں شروع کی جب کہ وہ خاصے ضعیف ہو چکے تھے اور بینائی بھی جواب دے رہی تھی لیکن ضمیر کہہ رہا تھا (جیسا کہ انھوں نے خود اِس کتاب کے شروع میں لکھا ہے) کہ "عمر بھر شاعری کرتے رہے ہو اُس کا کفارہ ادا کرو اور اللہ تعالیٰ نے جو طبعِ موزوں کی نعمت عطا کی ہے اُس کا شکر ادا کرو۔ شاعری کا کفارہ یہ ہے کہ حمدِ باری تعالیٰ اور نعتِ رسولِ مقبول صلی اللہ علیہ وسلم کثرت سے لکھو۔ . . . . ." حضرت ساجد نے اسی جذبے کے تحت

یہ نعتیں ہی تھیں جن کو وہ اپنے لیے وسیلۂ مغفرت سمجھتے تھے اور بہترین مشغلہ بھی ۔ ایک جگہ فرماتے ہیں :-

دن رات شعر لکھتا ہوں نعتِ رسولؐ کے
مصرف یہی نکالا ہے میں نے دماغ کا

انھوں نے اپنی نعتوں کے لیے غالبؔ کی زمینیں اختیار کی ہیں کیوں کہ یہ زمینیں عموماً شہرت رکھتی ہیں، لیکن اُن کا اصل مذاق دینی ہے اور اکثر و بیشتر مقامات پر قرآن و حدیث ہی کی تلمیحات ہیں ۔ مثلاً :-

"لا تقنطوا من رحمۃ اللہ"(۱) سے یہ مضمون اختیار کیا :

تسلی دی مجھے لاتقنطوا لاتقنطوا کہہ کر ۔ نہ جب دیکھا گیا اللہ کی رحمت کو غم میرا

حدیث "الدنیا سجن المؤمن"(۲) سے یہ شعر اختیار کیا :-

دولتِ صبر حدیثِ نبویؐ نے بخشی ۔ میں نے اس غمکدۂ دہر کو زنداں سمجھا

آیت "نحن اقرب الیہ من حبل الورید"(۳) سے یہ شعر متأثر ہے :-

مٹ گیا خوف و خطر دل سے ہمارے ساجدؔ ۔ جب قریبِ رگِ جاں ہم نے نگہباں سمجھا

"وما ینطق عن الھویٰ ان ھو الا وحی یوحیٰ" حضورِ انور صلی اللہ علیہ وسلم کی گفتگو کی شان ہے ۔ حضرت ساجدؔ لکھتے ہیں :-

تھا حقیقت میں کلام اُس کا کلام اللہ ۔ خود وہ قرآن بھی قرآن کی تفسیر بھی تھا

دوسرے مصرع میں اُس حدیث کی طرف اشارہ ہے جس میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کا قول ہے کہ کسی نے حضورِ انور صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق دریافت کیا کہ وہ کیسے تھے، تو آپ نے فرمایا کہ "کیا تم نے قرآن نہیں پڑھا؟"

---

(۱) اللہ کی رحمت سے مایوس نہ ہونا ۔ (۲) دنیا مومن کے لیے قید خانہ ہے
(۳) ہم تمہاری شہ رگ سے زیادہ قریب ہیں ۔

"لقد کان لکم فی رسول اللہ اسوۃ حسنۃ" (حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم میں یقیناً بہترین کردار ہے)۔

وہ پیمبر بھی تھے اور معلّمِ اخلاق بھی تھے — اُن کا ہر ایک عمل خُلق کی تصویر بھی تھا

حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک حدیث بھی ہے کہ بُعِثْتُ لِاُتَمِّمَ مکارمَ الاخلاق (میں بہترین اخلاق کی تکمیل کے لیے بھیجا گیا ہوں) اس حدیث کا مضمون مذکورۂ بالا شعر میں ہے :۔

"وما ارسلناک الا رحمۃ للعالمین" کی آیتِ مبارکہ سے یہ ماخوذ ہے :۔
(اور ہم نے نہیں بھیجا آپ کو مگر تمام جہانوں کے لیے رحمت بنا کر)

حضرتؐ کے سوا کوئی پیمبر نہ ہُوا تھا — اللہ کا محبوب ہو اور رحمتِ عالم

لولاک لما خلقت الافلاک "اگر آپ نہ ہوتے تو میں آسمانوں کو (بھی) پیدا نہ کرتا" کا مضمون اس شعر میں ہے :۔

شہِ لولاک ہے باعث جہانِ مرغ و ماہی کا — نہ کیوں محبوبِ حق محبوب ہو ساری خدائی کا

ایک موقع پر حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا تھا کہ میں حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کا قنبر ہوں۔ یہ مضمون اس شعر میں آتا ہے :۔

عمرؓ آقا انھیں کہتے تھے یہ شانِ بلالیؓ تھی — یہاں معلوم ہوتا ہے عیاں بندہ نوازی کا

ایک حدیث ہے "اشرافُ اُمتی حَمَلَۃُ القرآن و اصحابُ اللیل" ①

حضرت ساجد کہتے ہیں :۔

مجھے تو اپنے سجدے اس لیے محبوب ہیں ساجد — کہ محبوبِ خدا کو پاس خاطر ہے نمازی کا

---

① میری اُمت میں اشراف وہ ہیں جو قرآن اٹھاتے ہیں (پڑھتے ہیں) اور راتوں والے ہیں (راتوں کو تہجد وغیرہ میں معروف رہتے ہیں)۔

آیت "قلنا یٰنار کونی بردًا و سلامًا" (ابراہیم علیہ السلام کو نمرود نے
آگ میں پھینکا تو "اللہ نے فرمایا، اے آگ ٹھنڈی ہو جا اور سلامتی بن جا
ابراہیمؑ پر") سے یہ مضمون لیا گیا ہے :۔

دوست کو آیا نظر جب جذبۂ ایثارِ دوست   آتشِ نمرود کو فوراً کیا گلزارِ دوست

"ختم اللہ علیٰ قلوبھم وعلیٰ سمعھم و علیٰ ابصارھم غشاوۃ" قرآن
کے منکروں کے متعلق ہے کہ "اللہ نے اُن دلوں پر مُہر لگا دی اور اُن کے کانوں پر
(بھی) اور اُن کی آنکھوں پر پردہ ڈال دیا۔ سے یہ مضمون اخذ کیا ہے :۔

بوجہل پاس رہ کے بھی ایمان نہ لا سکا   قلب و نظر پہ مُہر لگی ہو تو کیا علاج؟

لا یکلف اللہ نفسًا الا وسعھا (کسی انسان کو اس کی طاقت سے زیادہ
پابند نہیں کیا گیا) سے یہ شعر ماخوذ ہے :۔

برداشت سے سوا انہیں دیتے وہ کلفتیں   دیتے ہر ایک شخص کو ہیں بار دیکھ کر

"الیوم اکملت لکم دینکم ..." سے یہ مضمون لیا ہوگا :۔

ہوئی ختم جو خوبی خلّاق کو تخلیقِ انساں سے
ہوئی تکمیل اُس کی بعثتِ شاہِ رسولاں سے

"قال ابوھم انی لاجد ریح یوسف ..." (اُن کے والد یعقوب
علیہ السلام نے کہا کہ میں بے شک یوسفؑ کی خوشبو پاتا ہوں) سے اس شعر کا
مضمون ہوگا :۔

یوسفؑ کی اُن کو آنے لگی بوئے پیرہن   یعقوبؑ تک تو پہنچا نہ تھا پیرہن ہنوز

"لا تحزن ان اللہ معنا" غار ثور میں کافروں کی آہٹ سُنتے پر حضور انور
صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ سے فرمایا (تو فکر نہ کر۔
بے شک اللہ ہم لوگوں کے ساتھ ہے۔) سے ضرورتِ شعری کی بنا پر یوں کہا گیا :۔

کہ حضرت صدیقؓ سے کہتے تھے حضورؐ
پہنچے کفار کے جس وقت قدم غار کے پاس

و و الضحیٰ والیل اذا سجیٰ " (حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کے چہرۂ انور
کو ضحیٰ سے تشبیہ دیتے ہیں اور اُن کے گیسو کو لیل (رات) سے اُنٹ ... دی
...) سے یہ مضمون لیا ہو گا
ضحیٰ جیسے پڑھی جاتی ہو والیل کے ساتھ
اس طرح گیسوئے سرکارؐ تھے رخسار کے پاس
وما ارسلناک الا کافۃ للناس بشیراً ونذیراً ... و ... نہیں ...
... آپ کو مگر سارے لوگوں کے لیے کافی، خوش خبری سنانے والا اور
... خوف دلانے والا
آپ نے خدا زمانے کو کیا اپنا مطیع — آپ سے بڑھ کر نہیں سارے عالم ...
ھل اتیٰ علی الانسان حین من الدھر لم یکن شیئاً مذکورا
سورۃ الدھر کی پہلی آیت ہے کیا انسان پر زمانے کا ایک ... نہ ...
نہیں آیا جب کہ وہ جانا بھی نہیں جاتا تھا؟
پیش تخلیق حضرت آدمؑ — تھے شب و روز ماہ و سال کہاں
" رضی اللہ عنہم ورضوا عنہ " اللہ ان سے راضی ہوا اور وہ
اللہ سے، عظیم انسانوں کی علامت ہے شعر میں:
وہی انسان حقیقت میں ہے انسانِ عظیم
اُن کی مرضی کے سوا کچھ جسے منظور نہیں
سبحٰن الذی اسریٰ بعبدہ لیلاً ... پاک ہے وہ ذات ...

؎ تصوّر نے مرے تصویرِ طیبہ کھینچ کر دل پر
بڑھا دی شان و شوکت بھی اللہ کے گھر کی

؎ میں داغ لے کے جاؤں گا عشقِ حبیبؐ کا
کچھ تو خدا کی نذر کو سوغات چاہیے

؎ میرے پہلو میں سمٹ کر آ گئی ہے کائنات
دل ہے کعبہ اور گلزارِ مدینہ دل میں ہے

لیکن ان تمام نعمتوں کا ما حصل (جیسا کہ حضرت ساجدؔ نے فرمایا ہے) حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی غلامی اور پیروی ہے اور یہی انسانی زندگی کا عین مقصد ہے۔ ساجدؔ اس طرح فرماتے ہیں:

مجھ کو پابندِ شریعت کر گیا عشقِ رسولؐ
کیوں بھلا پابند ہو میرا جنوں زنجیر کا؟

بھیجا اپنے بندے کو راتوں رات (معراج شریف پر) کو یہ فرمانا خود ہوگا ۔

قربِ خدا کا راستہ ہم کو دکھا دیا کہ یوں
خود بھی رسولِ پاک نے چل کر دکھا دیا کہ یوں

اس طرح کے بکثرت اشعار ہیں جن میں قرآن و حدیث کی تلمیحات ملتی ہیں ۔ اور ان سے اندازہ ہوتا ہے کہ حضرت ساجدؔ نے کس ماحول میں پرورش پائی تھی ۔ ان تلمیحات کے علاوہ ان کے اشعار میں شعری نکتہ آفرینیاں بھی بہت پائی جاتی ہیں ۔ ندرتِ اسالیب بھی ہے ۔ مثلاً ۔ اس مجموعے کا پہلا شعر ہے :۔

ہے درخشاں ایک پہلو یہ مری تقدیر کا
واسطہ ہوا اُن کی رحمت کو مری تقصیر کا

تقصیر کا واسطہ ، رحمت سے ہونا شعری طور پر ندرت رکھتا ہے ۔

قلب اعرشِ الٰہی گفتہ اند ۔ "این زمین را آسمانے دیگر است" کسی کا شعر ہے اور اسی قلب میں جب مدینہ طیبہ کا نقشہ بھی ہو تو اس کی قدر و منزلت کس قدر بڑھ جائے گی ۔ ساجدؔ کہتے ہیں :۔

ہو گوشہ گوشہ جو اس میں مدینہ کا بھی نقشہ ہو
ہر شے پہ ہو افضل مرے دل کا جامِ جم میرا

صرف ایمان ہی اصل قوت ہے اور اس عقیدے کی تائید قرآن سے بھی ہوتی ہے کہ جس میں دس پر ایک کا بھاری ہونا مذکور ہے ۔

حضرت ساجدؔ کہتے ہیں :۔

عطا کی قوتِ ایمان نے وہ ہمت مسلماں کو
کہ ہو کر رہ گیا اک لفظ سہل لفظِ مشکل کا

خدا سے خدا ہی کے محبوب کو طلب کرنا گستاخی سہی لیکن یہ بھی بڑے حوصلے کی بات ہے ۔ حضرت ساجدؔ کہتے ہیں :۔

خدا سے اُس کے محبوب کا گستاخ طالب ہو
ذرا دیکھے کوئی یہ حوصلہ ساجدؔ سے سائل کا

[illegible] کا شعر ہے :۔ ز عشقِ مصطفےٰ دل زندہ دارم ۔ رقابت با خدائے خویش دارم

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

ادب گلشن آبادیؒ

حضرت ادبؒ کا تعلق گلشن آباد (یعنی ریاست جاورہ) سے تھا جو میرے بزرگوں کا بھی مسکن رہا ہے۔ آپ کے والدین ماجدین کی اعلیٰ تربیت پھر آپ کے شیخ علیہ الرحمہ کی صحبت نے آپ کے اخلاقِ حمیدہ اور اوصاف پاکیزہ کو اس قدر پُرکشش بنا دیا تھا کہ آپ سے ملنے والا پہلی ملاقات ہی میں آپ کا گرویدہ بن جاتا تھا۔ پاکستان آنے کے بعد آپ کا قیام شروع میں میرپور خاص (سندھ) میں تھا۔ راقم الحروف کسی تقریب میں وہاں شریک ہوا تو آپ کے غیر معمولی انکسار، تواضع، ورع و تقویٰ سے بہت متاثر ہوا۔ آپ کے یہی وہ اوصاف تھے جنھوں نے آپ کو مرجعِ خلائق بنا دیا تھا اور بکثرت لوگ آپ سے مستفیض ہوتے رہتے تھے۔ اُن کو دیکھ کر یہ قول یاد آتا تھا:

"اَلطَّرِیْقُ کُلُّہٗ اَدَب"۔ پھر کراچی کے قیام کے زمانے میں آپ کے شیخ علیہ رحمہ کے عرس کے موقع پر حاضری نصیب ہوئی تو وہاں بھی آپ کی شرعی زندگی دیکھ کر دل کو بڑی فرحت حاصل ہوئی۔ یہ پہلا موقع تھا جب کہ آپ کی زبانِ مبارک سے یہ نعت سُنی:-

کشتی ہے منجدھار محمدؐ　　کیجیے بیڑا پار محمدؐ
اسراء کے انوار محمدؐ　　طور پہ جلوہ بار محمدؐ
میری غلامی سبحان اللہ　　میرے ہیں سرکار محمدؐ

جیسے قرآن بولا ہو — نرمی ہے گفتار محمدؐ
دل میں جب بھی چھیڑا — بول اٹھا ہر تار محمدؐ
تو علم دے کر بول راہ جو بھٹکے — جن کے ہوں سالار محمدؐ
خواہش ہے بس آپ کی حد حاصل — روضے کی دیوار محمدؐ

سبحان اللہ۔ کس قدر پُرکیف نعت ہے! حضرت ادیبؔ خود بھی محوم رہے تھے اور سامعین پر وجد کی کیفیت طاری تھی۔ حقیقت یہ ہے کہ حضور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ذکرِ مبارک کے ایسے لمحات مجھے بہت کم نصیب ہوئے ہوں گے۔ اس وقت علامہ اقبالؒ کا یہ شعر یاد آرہا تھا :-

تو فرمودی رہِ بطحا گرفتیم — وگرنہ جز تو ما را منزلے نیست

حضرت ادیبؔ کی نعت میں کیف و مستی زیادہ ہے اور سادگی و پُرکاری ہے۔ افسوس کہ آپ کا بہت سا کلام اب دستیاب نہیں، تاہم جو کچھ ہے وہ ان کے اعلیٰ ذوق کا شاہد ہے۔ چند اشعار ملاحظہ ہوں :-

کوئی کیا سمجھے ہمارا رازِ دریوزہ گری — مانگتے ہیں رب سے رب کو ہم برائے مصطفیٰ
بجز خلاقِ عالم تم سے ہے تخلیقِ ہر عالم — بنائے کُن فکاں تم اور وجہ ما سوا تم ہو
دل میں سمان کیا ہے یوں آن کو — عرش کو آئینہ دکھاتا ہے

ہر کام یہ جو بڑھتا نہ ہے وہ عشق نبیؐ کا عشق نہیں
وہ راہ ہم احمدؐ کی نہیں جس راہ میں منزل آجائے

ادیبؔ کعبۂ عقل، محرابِ و منبر — مرا کعبۂ عشق، روئے محمدؐ
آنچہ در روئے محمدؐ مصطفیٰؐ من دیدہ ام — اے ادیبؔ گیرد زباں از گفتنش شرح بیتی
بہ عقبیٰ جز عطائے تو، بہ دنیا جز ولائے تو
سروساماں نمی دارم اغثنی یارسول اللہ

پھر یہ شعر حضرت ادبؔ کے ارمان کو پورا کرنے کے لیے ممدِ دل ہوا :-

ادبؔ کاش پوری ہو دل کی یہ حسرت
بنے اپنا مدفن دیارِ مدینہ

دیارِ مدینہ، دیارِ مکّہ پر محیط ہے اس لیے وہیں کے ہو رہے اور مستقل حاجی بن گئے۔

اقبالؒ نے سچ کہا ہے کہ :-

منزلِ عشق بسے دور و دراز است ولے
طے شود جادۂ صد سالہ بہ آہے گاہے

اللہ تعالیٰ اُن پر لاکھوں رحمتیں ہر لحظہ نازل فرماتا رہے!
آمین۔

میرے والدین

تاریخِ اسلاف (۱۳۸۳ھ) میں ددھیال اور ننھیال کے عزیزوں کے حالات لکھ چکا ہوں۔ پردادا امیر مولی خان نے انگریزوں سے جنگ میں چیف کمشنر مسٹر ہوتاکہ ۔ لے کو سیونی (سی۔پی) میں ۱۷ اگست ۱۸۲۷ء کو قتل کیا، خود بھی تلوار کا نشانہ بنے (کہ کندھے سے پیٹ تک ضرب آئی)۔ والد اور چچا دہیں شہید ہوئے۔ پھر پردادا اپنے بھائیوں کے ساتھ جبل پور کے قریب دس میل شمال میں قصبہ پناگر کو منتقل ہو گئے۔

میرے دادا وزیر خان غالباً ۳۰ سال کی عمر میں فوت ہو گئے۔ اُن کے چھوٹے بھائی حافظ موسیٰ خان بھی نوجوانی میں فوت ہوئے۔ اس لیے پورے خاندان کی ذمہ داری پردادا کے حصے میں آئی۔ انھوں نے میرے والد کی شادی (غالباً ۲۰ سال کی عمر میں) ۱۸۹۵ء میں کر دی۔

میرے والد گلاب خان کے دو بھائی اکبر خان اور غازی خان (ارباب خان) تھے۔ والد صاحب بہت خوبصورت تھے لمبی ناک، کشادہ پیشانی، بڑی بڑی آنکھیں کہ جب سوتے تھے تو پپوٹوں سے آنکھیں کھلی ہوئی نظر آتی تھیں۔ چہرہ گلاب کا پھول نظر آتا تھا۔ اس لیے اُن کی والدہ نے اُن کا نام گلاب خان رکھا تھا۔ بہت ذہین اور سلیقہ مند تھے۔ پناگر چھوٹا سا قصبہ تھا۔ وہاں صرف ایک اسکول تھا اور وہ بھی ہندی کا تھا۔ والد صاحب نے

وہاں سے پرائمری کا امتحان اعلیٰ نمبروں سے پاس کر کے جبل پور کے نیچرز نارمل
اسکول میں سب سے نمایاں کامیابی حاصل کی اور انعامات بھی حاصل کیے لیکن
اسکول ٹیچر بننے کے بجائے بعض حضرات کے مشورے سے ریلوے پولیس میں
حوالدار ہو گئے۔ اپنے کام میں بہت کامیاب اور سخت کوش تھے تو بعض
حاسدوں نے مختلف حربے مخالفت میں استعمال کیے تو آپ نے استعفاء
دیدیا اور اسکول میں مدرّس ہو گئے۔ آپ اردو اور ہندی میں بہت خوشخط
تھے۔ نقشے اور خاکے بہت نفاست کے ساتھ بناتے تھے۔ میرے پردادا
۱۸۹۶ء میں فوت ہوئے تو میرے والد صاحب مستقل طور پر جبل پور میں قیام
پذیر ہو گئے۔ پردادا کی جائیداد بہت تھی۔ ایک بہت بڑا کھیت تھا جس میں ایک سو
بوریاں گندم کی بوئی جاتی تھیں۔ ایک باغ آموں کا تھا۔ دو زمینیں تھیں۔ مکان
تھا۔ والد صاحب نے یہ سب جائیداد اپنے عزیزوں کو بخوشی بخش دی۔

والد صاحب سخاوت میں بہت پیش پیش تھے۔ عزیزوں کا بڑا خیال رکھتے
تھے۔ اُن کے گھر جب بھی جاتے تو بچوں کے ہاتھ میں ایک روپیہ رکھ دیتے تھے
(اُس زمانے میں ایک روپیہ بہت قیمتی تھا)۔ میرے بڑے بھائی نذیر احمد خان کو
تعلیم دلوائی جب وہ نویں جماعت میں تھے تو والد صاحب بہت بیمار ہو گئے۔
مجبوراً اُن کی تعلیم روک دی گئی۔ اور ان کو سیونی میں پوسٹ آفس کی کلرکی
کرنا پڑی۔ یہ ۱۹۱۶ء کا واقعہ ہے۔ اُس وقت تیس روپے اُن کی تنخواہ تھی۔
پندرہ روپے اپنے پاس رکھتے تھے اور پندرہ گھر بھیجتے تھے۔ بعد دوسرے
سال اُن کا تبادلہ کٹنی کو ہو گیا۔

والد صاحب نے اپنی جمع کردہ رقم میں سے ایک سو دس روپے میں
ایک وسیع مکان جبل پور میں خریدا اور پھر اسکول میں مدرّس ہو گئے۔ اُسی

زمانے میں ایک مرتبہ سردی کے موسم میں والد صاحب مجھے بازار لے گئے۔ تو وہاں
پہلی جنگِ عظیم کے سپاہیوں کے پرانے کوٹ فروخت ہو رہے تھے۔ درزیوں نے
پرانے کوٹ سے بچوں کے لائق بھی کوٹ تیار کر لیے تھے۔ والد صاحبؒ کے ایک
دوست نے کہا کہ آپ کا بچہ سردی میں ٹھٹھر رہا ہے۔ اس کے لیے ایک کوٹ خرید
لیجیے۔ والد صاحب نے فرمایا کہ مجھے اس کا ٹھٹھرنا پسند ہے لیکن غیر کا اُتارا
ہوا کپڑا پسند نہیں۔ ہاں اگر کسی بزرگ کا اُتارا ہوا کپڑا ہو تو وہ پہن سکتا ہوں۔

پرائمری کے امتحان میں اللہ تعالیٰ کے فضل سے پورے شہر میں میرے نمبر
سب سے زیادہ تھے تو مجھے چار سال تک چار روپے ماہوار بطور وظیفہ
دیے گئے۔ والد صاحبؒ نے اس وظیفے کی رقم سے ساٹھ روپے میں ایک اور مکان
خرید لیا جو پہلے مکان سے ملحق تھا۔ پھر دونوں مکانوں کو ایک کر لیا۔ اس میں
پانچ کمرے اور دو صحن بن گئے۔ بڑے بھائی صاحب نے اور ہم لوگوں نے مل کر
وہاں ایک کنواں کھود لیا۔ اُس کا پانی بہت صاف اور شیریں تھا۔ پورا کنواں صرف
دس ہاتھ گہرا تھا۔

والد صاحبؒ نے ریلوے کی ملازمت کے زمانے میں کلکتہ کا سفر کیا تھا — غالباً
تھانہ بھون بھی گئے تھے۔ مولانا اشرف علیؒ نے ایک جگہ اُن کا ذکر کیا ہے۔

والد صاحب خوش خلق اور خوش مزاج تھے۔ مجھے یاد ہے کہ میرے بڑے
ماموں مولوی عبدالمجید خان اپنے چھوٹے بھائی عبدالجلیل خان پر ناراض ہو رہے
تھے۔ والد صاحب نے بڑے ماموں سے کہا کہ مولانا صاحب کھڑے ہو کر وعظ
نہ فرمائیں۔ تخت پر بیٹھ کر اطمینان سے وعظ فرمائیں۔ پھر تو سب لوگ ہنسنے
لگے اور ماموں صاحب کا غصہ ختم ہو گیا۔

والد صاحب نے اپنی آخری بیماری کے زمانے میں ایک دن مجھے اپنے

پاس بٹھا کر نماز کا طریقہ سمجھایا، دعائیں یاد کرائیں اور استقامت کے لیے دعا بھی فرمائی۔ اس سے پہلے جب میں قریب پانچ سال کا تھا تو بڑے بھائی صاحب نے مجھے پہلے پارے کے چند رکوع خوب سمجھا کر پڑھا دیے تھے۔ پھر میں خود ہی ہر روز ایک پاؤ پارہ پڑھ لیتا تھا۔ جب میرا ناظرہ مکمل ہوا تو والد صاحب نے فرمایا کہ بیٹا میرا قرآن پاک سن لیا کرو اور اگر کوئی غلطی ہو جائے تو اصلاح کر دیا کرو۔ میں سمجھا کہ میں والد صاحب کا استاد بن گیا ہوں۔ اس طرح پورے قرآن میں انھوں نے میری غلطیوں کی اصلاح فرما دی۔ پھر والدہ صاحبہ نے بھی یہی طریقہ اختیار کیا اور میرا ناظرہ صحیح کرا دیا۔

والد صاحب سہ شنبہ ۱۸ ذی الحجہ ۱۳۴۲ھ (۲۳ جولائی ۱۹۲۴ء) کو جبل پور میں اللہ کو پیارے ہوئے۔ مجھ پر ان کی شفقت سب اولاد سے زیادہ تھی۔ انتقال سے چند روز پہلے وہ مجھ پر اس غرض سے ناراض ہوئے کہ میں انھیں زیادہ یاد نہ کروں۔ یہ بات انھوں نے والدہ صاحبہ کو بتا دی۔ لیکن کون ہے جو اپنے ماں باپ کی جدائی پر روتا نہ ہو۔ میں تو اب بھی روتا ہوں کہ بزرگانہ شفقتوں سے ہمیشہ کے لیے محروم ہو گیا۔ جبل پور میں جب تک قیام رہا ہر جمعہ کو ایصالِ ثواب کے لیے والد صاحب اور عزیزوں کے مزارات پر حاضری دینے کی سعادت حاصل ہوتی رہی۔ افسوس کہ اب اس سعادت سے بھی محروم ہوں ؎ اے آرزوئے دیدۂ بینا چگونہ‌ای ... ما بے تو در غمیم تو بے ما چگونہ‌ای

۱۹۶۵ء میں ہندوستان اور پاکستان کی جنگ ہوئی تو والد صاحب خواب میں تشریف لائے۔ فوجی لباس میں تھے۔ میں نے عرض کیا کہ بابا جان آپ کو فوجی لباس سے کیا تعلق ہے؟ فرمانے لگے کہ "کچھ کام تھا"۔ کام نہیں بتایا لیکن اندازہ ہوا کہ وہ (بحمد اللہ) اللہ تعالیٰ کی فوج میں شامل

کر لیے گئے ہیں۔ اور وہ یہاں حیدرآباد (سندھ) میں مسلمانوں کی خدمت کے لیے بھیجے گئے تھے۔

میری والدہ محفوظ النساء حضرت مولانا عبد القادر خان ٹونکی ثم جبل پوری (م ۱۹۰۰ء) کی بہت چہیتی بیٹی تھیں۔ بہت ذہین اور معاملہ فہم تھیں۔ سخت عُسرت کے زمانے میں کسی سے امداد کے لیے اشارہ بھی نہیں کیا۔ اُن کے بڑے بھائی قریب ہی رہتے تھے لیکن اُن کو پتا بھی نہ چل سکا کہ ہم لوگ ضرورت مند ہیں۔ چولھے پر دیگچی چڑھا دیتی تھیں تاکہ لوگ سمجھیں کھانا پک رہا ہے۔ حالانکہ اس میں کچھ بھی نہ ہوتا تھا۔ اور خود فاقہ کر لیتی تھیں۔ خوددار اس قدر تھیں کہ ضرورت کے وقت کسی سے برتن تو کیا، پانی بھی نہ مانگتی تھیں۔ اگر کبھی مہمانوں کے لیے کچھ زیادہ پکانا پڑتا تو ایک ہی قسم کا کھانا دو برتنوں میں پکا لیتی تھیں۔ اگر فرش کی ضرورت ہوتی تو دو چادریں بچھا لیتی تھیں لیکن کسی سے اپنی حاجت کا اشارہ کرنا بھی معیوب سمجھتی تھیں۔ اکثر کہا کرتی تھیں کہ "ننگ کھاؤ، ننگ نہ کھاؤ"۔ میری تربیت میری ہمت افزائی سے کرتی تھیں۔ مجھے سُنا سُنا کر عورتوں سے کہتی تھیں کہ "میرا بچہ بڑا فرماں بردار ہے اور اسے پڑھنے کا اس قدر شوق ہے کہ کھانے تک کی پروا نہیں کرتا۔ اور ابھی سے نماز اور قرآن پاک کی تلاوت پابندی سے کرتا ہے"۔

ان جملوں سے مجھے اپنی اصلاح کا شوق پیدا ہوتا تھا اور تعلیم کے لیے رغبت پیدا ہوتی تھی۔

میرے بچپن میں ماہِ رمضان سخت گرمی کے موسم میں واقع ہوتا تھا۔ والدہ صاحبہ مجھے روزہ رکھنے کا شوق دلانے کے لیے فرماتی تھیں کہ "سحری آتی ہے تو عمدہ کھانے ساتھ لاتی ہے۔ کباب، پراٹھے، مٹھائی وغیرہ لاتی ہے۔ جو

بچے جاگ جاتے ہیں انھیں یہ سب کھانے مل جاتے ہیں اور جو نہیں جاگتے وہ محروم رہ جاتے ہیں۔" میں سمجھتا تھا کہ سحری کوئی عورت ہے جو رمضان شریف میں اچھے اچھے کھانے تقسیم کرتی ہے۔ پھر میں والدہ سے کہتا کہ اماں مجھے ضرور جگا دینا۔ میں بھی روزہ رکھوں گا۔ چنانچہ والدہ صاحبہ جب حسب حیثیت کھانے تیار کر لیتی تھیں تو مجھے جگا دیتی تھیں کہ اٹھ جاؤ، دیکھو سحری کیا کیا کھانے دے گئی ہے۔ نصف شعبان کی رات کی بیداری کے لیے بھی اسی طرح ایک ترکیب یہ تھی کہ دیکھو اس رات کو اللہ تعالیٰ ایک درخت ایسا لگا دیتا ہے جس کی ہر پتی میں ہر شخص کا نام (سلامتی کے لیے) لکھوا دیا ہے۔ جو بچے جاگتے ہیں اُن کو سلامتی حاصل ہوتی ہے اور جو نہیں جاگتے اُن کے نام کا پتا کاٹ دیا جاتا ہے (شاید اسی طرح محاورہ بھی ہے اور ایک روایت بھی مشہور ہے)۔ میرے بچپن میں (قریب ۱۰۔۱۱ سال کی عمر میں) جبل پور میں طاعون کا زور ہوا۔ ہر روز قریب ایک سو افراد فوت ہو جاتے تھے۔ شہر میں خوف و ہراس پھیلا ہوا تھا۔ لوگ اپنے مکان چھوڑ کر جنگل میں جھونپڑیاں بنا کر رہنے لگے تھے۔ والدہ صاحبہ کا حکم تھا کہ ہرگز خوف مت کرو اور حتی الامکان ہر مسلمان کے جنازے کے ساتھ قبرستان جایا کرو اور ہر مسلمان مرحوم کے لیے (خواہ اخبار میں کسی کے انتقال کی خبر ہو) سورۃ الفاتحہ اور کم از کم تین مرتبہ سورۃ الاخلاص پڑھ کر بخش دیا کرو۔ اس طرح اللہ تعالیٰ نے مجھے بڑی ہمت عطا فرمائی اور ایصالِ ثواب کرنے کا جذبہ مرحمت فرمایا۔

ماں کی شفقت اولاد پر بہت ہوتی ہے۔ کوئی اچھی چیز تھوڑی ہوتی تو فرماتی تھیں کہ "تم کھا لو، میرے پیٹ میں پہنچ جائے گی۔" کبھی غصہ آ جاتا تو فرماتیں "تیرا گھر [illegible] بنا دوں؟" اللہ اللہ، فقط

بھی زحمت ہوتا۔

ہم لوگوں کے لیے دعا اس طرح مانگتی تھیں کہ " اے اللہ ان لوگوں کیلیے تیرے در کی بھیک مانگتی ہوں اور تیرے پیاروں کا صدقہ مانگتی ہوں۔" میں نے اُن کی ایسی دعا کو کبھی رَد ہوتے نہیں دیکھا۔

میرے ایک عزیز جو ساتھ رہتے تھے محلّے بھر کے لوگوں کو پریشان کیا کرتے تھے، کوئی جا رہا ہوتا تو اُس کو پیچھے سے آکر ڈھکیل دیتے۔ کسی کے سَر پہ سامان ہوتا تو اُس کا بوجھ بدکا کر دیتے۔ درخت پر چڑھ جاتے اور آنے جانے پر تھوک دیتے۔ ایسی شرارتوں سے لوگ تنگ آ گئے تھے۔ چنانچہ وہ لوگ گھر پہ آئے اور کہا " امّاں، اس لڑکے نے ہم سب کو تنگ کر رکھا ہے۔" والدہ نے صرف ایک جملہ فرمایا کہ " لے جاؤ اس کو اور خوب مارو۔" اس جملے سے اُن لوگوں کو تسلی ہو گئی اور یہ عزیز ڈر گئے کہ اگر اب شرارت کی تو وہ لوگ پٹائی کریں گے۔

والدہ صاحبہ بڑی ہمت اور حوصلے والی تھیں۔ ایک مرتبہ وہ گھر میں تھیں۔ رات کو چوروں نے حملہ کرنا چاہا۔ اور دروازہ زور زور سے کھٹکھٹایا۔ والدہ نے زور سے فرمایا کہ " ٹھہرے رہو اگر مرد کے بچے ہو۔ میں دروازہ کھولتی ہوں۔" چنانچہ والدہ نے دروازہ کھولا اور تلوار لے کر آگے بڑھیں تو وہ سب بھاگ گئے۔

جبل پور کے مکان کے قریب ہی ایک ہندو کا مکان تھا۔ اس نے کچھ شرارت کی اور ہم لوگوں کو پریشان کیا، والدہ نے اس سے کہا کہ ٹھیک ہو جا، ورنہ تجھے تیرے گھر میں گھس کر ماروں گی۔" اسی طرح کے کئی واقعات پیش آئے

جن کی تفصیل کیا عرض کروں!

والدہ صاحبہ کے انتقال پر ایک بزرگ میرے پاس آئے اور فرمایا کہ میاں، اب تک تو والدہ کی دعاؤں سے خوب عیش کیا ہے۔ لیکن اب محتاط زندگی گزارنا۔ کیوں کہ اب وہ زندہ نہیں ہیں اور اب اُن کی دعائیں تمہارے لیے سپر نہیں بن سکتیں۔"

ہو

میرے پرائمری اسکول

۱۹۱۶ء میں میری عمر چار سال کی تھی۔ بڑے بھائی صاحب کو والد صاحب کی بیماری کی وجہ سے تعلیم چھوڑنی پڑی اور کسیونی میں کلرک ہوگئے۔ دوسرے سال کٹنی میں تبادلہ ہوگیا۔ میں نے گھر میں قرآن پاک کا ناظرہ پڑھا۔ پھر کٹنی کے پرائمری اسکول کی پہلی جماعت میں داخل ہوا۔ یہ اسکول میرے نانا مولانا عبدالقادر خان کی مسجد (چھپا محلّہ) سے ملحق تھا۔ وہاں میری بہن احمدی بیگم (جو مجھ سے دو ڈھائی سال بڑی تھیں اور اُسی زمانہ میں فوت ہوگئیں) میری اُنگلی پکڑ کر اسکول تک پہنچانے جاتی تھیں۔ لیکن بزرگوں کی دعائیں ہر وقت میرے ساتھ رہیں اور اللہ تعالیٰ نے مجھ حقیر کو اس قدر نوازا کہ میرا رُواں رُواں بھی زبان بن جائے تو اُس کا شکر ادا نہیں ہوسکتا۔ اس اسکول میں ایک اہتمام یہ تھا کہ علی گڑھ کی پیروی میں ہر بچے کے لیے تُرکی ٹوپی اور رُوشن کوٹ تمام تقاریب کے موقعوں پر اسکول ہی سے فراہم کیا جاتا تھا۔ بڑی شفقت کے ساتھ پڑھائی ہوتی تھی۔ پہلی کلاس کے اُستاد کا صحیح نام تو یاد نہیں۔ لیکن وہ مِن مِنا کر بولتے تھے تو اُن کا نام ہی مِنمِنا ماسٹر مشہور تھا۔ بہت عبادت گزار تھے۔ میں غالباً میٹرک پاس ہوگیا تھا اُس وقت تک وہ زندہ تھے اور جبل پور آتے تھے تو مجھے دعائیں دیتے تھے۔ سُنا ہے کہ آخر وقت تک اُن کی کوئی نماز ترک نہیں

٥١

ہوئی بلکہ جس دن انتقال ہوا اُس دن بھی نمازِ اشراق ادا کی، اس کے بعد انتقال ہوا۔
میں پہلی کلاس پاس کرنے کے بعد جبل پور آ گیا۔ اُس زمانے میں پرائمری کی پانچ کلاسیں ہوا کرتی تھیں۔ مجھے وہاں تیسری جماعت میں داخلہ مل گیا۔ تیسری جماعت میں میرے ساتھ احمد بیگ تھے جن کے ماموں حافظ محمد میاں خان (المتوفی ۱۹۷۵ء) ہر روز ایک قرآن پاک پڑھتے تھے اور آخر وقت تک ان کو یہ سعادت حاصل رہی۔ اسکول کی طرف سے وہ گزارہ کرتے تھے اور اُن کی بہن دوپہر کو احمد بیگ کے لیے کھانا لایا کرتی تھیں۔ میں بھی کھانا لے جاتا تو ہم دونوں ساتھ ہی کھانا کھایا کرتے تھے۔ یہ اسکول وہاں دلہائی محلّہ میں تھا۔ غالباً اُسی زمانے میں گھر کے پاس ایک حجام آیا۔ کئی لڑکوں نے اُس سے انگریزی بال بنوائے۔ میں نے بھی اُن کی طرح انگریزی بال ترشوا لئے۔ تھوڑی دیر میں والد صاحب تشریف لائے۔ میرے انگریزی بال دیکھے تو حجام کو بلوا کر پورا سر صاف کرا دیا۔ اس کے بعد مجھے ہمیشہ انگریزی بال سے نفرت رہی۔۔۔۔۔۔ چوتھی جماعت کے اُستاد احمد خان تھے۔ بہت محنت اور شفقت سے پڑھاتے تھے اور مجھے بعد میں بھی بہت دعائیں دیتے تھے۔ پانچویں جماعت کے اُستاد اظہر حسین تھے۔ میرے بڑے بھائی صاحب نے مجھے اس جماعت کے لیے کمنیا محلّے کے اسکول میں داخل کرا دیا۔ وہاں کے اُستاد سید حبیب اللہ صاحب تھے۔ بہت محنتی اور مخلص بزرگ تھے۔ (میرے بچپن کے دوست ڈاکٹر سید محمد سعید کے بہنوئی تھے)۔ مجھ پر بڑی شفقت فرماتے تھے۔ بہت خوش نویس تھے۔ میں اُن کی خوش نویسی اور اُن کی پڑھائی پر بہت توجہ دیتا تھا تو وہ میرے ساتھیوں کو میری مثال دے کر غیرت دلاتے تھے۔ ساتھیوں میں شرارت زیادہ تھی، پڑھائی برائے نام تھی۔

بحمد اللہ تعالیٰ کا خاص فضل ہوا اور میں پرائمری اسکول کے فائنل امتحان میں پورے شہر میں اوّل آیا۔ چنانچہ انعام کے طور پر مجھے چار سال تک چار روپیہ ماہانہ وظیفہ دیا گیا۔ انجمن اسلامیہ ہائی اسکول کی پہلی جماعت میں میں داخلہ لیا۔ وہاں بھی مجھے نمایاں کامیابی حاصل ہوئی۔ اس کلاس کے مدرّس بہادر ماسٹر تھے۔ وہ عیسائی تھے لیکن بڑی شفقت فرماتے تھے۔ پٹائی بھی کرتے تھے۔ لڑکے کو اپنے گھٹنوں پر لٹا کر اُن کی ٹانگوں پر بیت کی ضرب لگاتے تھے۔ اُس کا نام "انگریزی مار" رکھا تھا۔

دوسری جماعت میں غلام جیلانی صاحب اُستاد تھے۔ اللہ والے اور عبادت گزار تھے۔ میرے بڑے بھائی صاحب کے دوست تھے۔ وہ بھی بڑی شفقت فرماتے تھے۔ تیسری اور چوتھی جماعتوں میں محمد اسمٰعیل صاحب، رشید احمد صاحب، رحیم اللہ صاحب اور عبدالغفور صاحب استاد تھے۔

چوتھی جماعت (یعنی آٹھویں جماعت) کا امتحان بورڈ سے ہوا اس میں بھی مجھے نمایاں کامیابی حاصل ہوئی۔ اس کے بعد نویں جماعت میں بھی مجھے اعلیٰ کامیابی حاصل ہوئی۔ ماسٹر امتیاز صاحب، رفیع الدین صاحب، عبدالحمید صاحب اور دوسرے حضرات بڑی محنت سے پڑھاتے تھے۔

اس جماعت کے بعد ۱۹۲۷ء میں مجھے علی گڑھ جانے کا موقع حاصل ہوا۔ وہاں میٹرک (۱۹۲۹ء) سے لے کر دو ایم اے اور ایل ایل بی تک (۱۹۳۶ء) قیام رہا۔ پھر پبلک سروس کمیشن نے مجھے کنگ ایڈورڈ کالج۔ امراؤتی (برار) میں اردو کا استاد مقرر کیا۔ اس کے بعد کے حالات دوسری جگہ عرض کر چکا ہوں۔ تیسری جماعت

(یعنی ساتویں کلاس) کے اُستاد محمد اسمٰعیل صاحب نے ماشاء اللہ لمبی عمر پائی تھی۔ وہ اپنے طلبہ سے کہا کرتے تھے کہ تم غلام مصطفےٰ (یعنی محقق) بنو، منظور حسین شور (یعنی شاعر) مت بننا۔

ہُو

علی گڑھ کے بعض اساتذہ

راقم الحروف ۱۹۲۸ء میں علی گڑھ گیا۔ ۱۹۲۹ء میں میٹرک پاس کیا۔ اور ۱۹۳۶ء تک دو ایم اے اور ایل ایل بی پاس کر کے اپنے وطن جبل پور واپس ہوا۔ اس زمانے میں نویں۔ دسویں۔ گیارھویں اور بارھویں جماعتوں کے لیے انٹرمیڈیٹ کالج مخصوص تھا۔ اقامتی طلبہ کے لیے منٹو سرکل اور نیو سرکل (اردون سرکل) کے چار چار ہوسٹل تھے۔ سیمی بور اور ڈے اسکالر ان کے علاوہ تھے۔ منٹو سرکل کے ایک ہوسٹل میں جسے منٹو ۳ کہتے تھے، میٹرک کی کلاسیں ہوا کرتی تھیں اور منٹو ٹی جو دو منزلہ عمارت تھی اس کی اوپر کی منزل کے ایک سرے پر محترم عبدالمجید قریشی صاحب کا دفتر تھا۔ وہ اس کالج کے پرنسپل تھے۔ ان کے دفتر کے ساتھ ہی اُن کے سیکرٹری بشیر احمد صاحب کا دفتر تھا۔ ایک کلرک رحمت اللہ تھے۔ اس دوسرے دفتر کے عقب میں سید ولی محمد صاحب (وائس پرنسپل) کا دفتر تھا۔ ان دفتروں کے علاوہ اوپر کی منزل کے ہال میں لائبریری اور ریڈنگ روم تھا۔ بقیہ کمروں میں گیارھویں اور بارھویں کی کلاسیں ہوا کرتی تھیں۔

عبدالمجید قریشی صاحب

عبدالمجید قریشی صاحب بڑے رعب داب والے بزرگ تھے لیکن بہت شفیق بھی تھے۔ مونچھیں لمبی تھیں۔ اکثر پتلون پہنا کرتے تھے۔ لیکن ان کا کوٹ دوسرے اساتذہ کے کوٹ کی طرح بہت لمبا ہوتا تھا۔ (بغیر کوٹ کے، صرف قمیص

اور پتلون پہننا اس زمانے میں معیوب سمجھا جاتا تھا)۔ ہمارے پرنسپل صاحب اکثر مغرب کی نماز ان دونوں سرکلوں میں پڑھتے تھے۔ راقم الحروف نیو سرکل کے جوبلی ہوسٹل میں تھا۔ وہاں پرنسپل صاحب باغ کے اندر مغرب کی نماز خود پڑھاتے تھے، حالانکہ وہاں پیش امام بھی مقرر تھے... طلبہ کے کھیلوں، مباحثوں، مشاعروں وغیرہ میں وہ برابر شرکت فرماتے تھے۔ طلبہ کی ہمت افزائی فرماتے تھے اور انعامات بھی تقسیم فرماتے تھے۔ طلبہ کی اُس زندگی کے مطابق بعض دلچسپ پروگرام بھی انھیں پسند تھے۔ مثلاً ایک طالب علم نے A musing on the Telephone کے نام سے خود ہی سائل اور خود ہی مجیب بن کر دیہاتی زبان میں ایک مکالمہ پیش کیا۔ زبان ایسی تھی کہ "میں نے کہ دینی گے بات ٹھیک نا ہے" (یعنی میں نے کہہ دیا کہ یہ بات ٹھیک نہیں)۔ پرنسپل صاحب نے ہمت افزائی فرمائی اور طالب علم کو انعام بھی دیا۔ ان کی کوٹھی میرس روڈ کے شمالی سرے پر تھی۔ ہم لوگ حاضر ہوتے تو بہت شفقت فرماتے۔ پھر اپنے باغ کے مختلف پودوں اور پھلوں کے درختوں کی شناخت کراتے تھے۔ ایک دفعہ مجھے شریفے کے درخت کی پہچان کرائی (شاید اس لیے کہ میرے وطن میں شریفہ بہت ہوتا تھا)۔ یونی ورسٹی سے اس کالج کے انضمام کے بعد پرنسپل صاحب ایم اے (ریاضیات) کی کلاسیں پڑھانے لگے تھے۔ پاکستان بننے کے بعد وہ کراچی تشریف لے آئے تھے اور وہیں انھوں نے ۱۰ جون ۱۹۸۲ء کو انتقال فرمایا۔

سیّد ولی محمد صاحب

اس کالج کے وائس پرنسپل سیّد ولی محمد صاحب تھے۔ نظم و نسق کے معاملے میں وہ بھی بہت سخت تھے اور بعض اساتذہ سے بھی پوچھ گچھ کر لیتے تھے۔ وہ

بھی اکثر لمبا سوٹ پہنتے تھے۔ کبھی کبھی علی گڑھ کے مونوگرام والے کپڑے کی شیروانی بھی پہنتے تھے جو اُنھیں بہت زیب دیتی تھی۔ وہ گیارھویں اور بارھویں جماعت کو بہت محنت سے انگریزی پڑھاتے۔ اُن کا تکیۂ کلام They said تھا۔ ایک مرتبہ ان کو پتھری کی تکلیف ہوئی تو یعقوب بیگ نامی صاحب (اُستادِ منطق) سے میں ایک نسخہ اُن کے لیے لایا۔ بہت خوش ہوئے لیکن فرمانے لگے کہ "بیٹے اس مرض کی تین قسمیں ہیں۔ جس قسم کی پتھری مجھے ہے اُس کے لیے یہ نسخہ صحیح نہیں" پاکستان بننے کے بعد وہ کراچی تشریف لے آئے تھے۔ کئی سال اردو کالج میں انگریزی پڑھاتے رہے۔ پرانے تعلق کی وجہ سے مجھ پر بڑی شفقت فرماتے تھے۔ پھر وہ لاہور تشریف لے گئے اور وہیں غالباً ۱۹۵۶ء میں انتقال فرمایا۔

دوسرے اساتذہ

دسویں جماعت کے زمانے میں میرا قیام جوبلی ہوسٹل (نیو سرکل) میں تھا۔ اُس کے شمالی سرے کے وارڈن شمس الہدیٰ صاحب تھے جو ریاضی پڑھاتے اور اُس کے جنوبی سرے کے وارڈن شیخ علی جواد صاحب تھے۔ دونوں بہت نیک اور نمازی تھے۔ لیکن شمس الہدیٰ صاحب اپنے کمرے ہی میں نماز پڑھتے تھے۔ البتہ شیخ علی جواد صاحب جو دینیات کے اُستاد تھے ہمیشہ باقاعدہ جماعت کے ساتھ نماز پڑھتے تھے جو متصل ہوسٹل میں ہوتی تھی۔ ظہر کے بعد جوبلی ہوسٹل کے ہال میں یہ دونوں بزرگ ہم لوگوں کو امتحان کی تیاری کرانے کے لیے جمع کرتے تھے۔ عصر کے بعد ایک اُستاد بنوٹ سکھاتے تھے۔ کچھ طلبہ سیکھتے تھے، کچھ اپنے کام کے لیے بازار چلے جاتے تھے۔ میٹرک کے زمانے میں میرے سیکشن ایف (F) کے انگریزی

پڑھانے والے اُستاد سعید الزماں صاحب تھے۔ حیدرآباد دکن والی شیروانی پہنتے تھے یعنی آستینوں کا سرا ڈبل ہوتا تھا ①۔ سنٹو ڈمی ہوسٹل کے وارڈن بھی تھے۔ ایک دن کلاس میں انھوں نے مجھ سے فرمایا کہ تم انگریزی کتاب لے کر آئے ہو؟۔ میں نے کہہ دیا کہ She Some body has just stolen it اس جواب سے ناراض ہو گئے اور فرمایا کہ Learn manners - اس عتاب سے اُن کی شرافتِ نفس ظاہر ہے اور میرے اس جواب سے میری طفلانہ حماقت کا ثبوت ملتا ہے۔ بہرحال وہ پھر مجھ سے خوش رہے اور پورا وقت کامیابی کے ساتھ گزر گیا۔

واجد علی شیدا صاحب۔ صبیح الدین حیدر صاحب جغرافیہ صبیح الدین حیدر صاحب پڑھاتے تھے۔ لڑکے اُن کو چپا کہتے تھے۔ چہرۂ مبارک ایسا تھا کہ گویا وہ غصہ میں ہوں۔ اسی لیے جب کبھی وہ مسکراتے تھے تو لڑکے کہتے تھے کہ آج بارش ہو جائے گی۔ وہ مجھ سے بہت خوش تھے کیوں کہ میں اپنے وطن کے اسکول سے جغرافیہ سے متعلق بہت کچھ پڑھ کر گیا تھا۔ اُن کے عزیز واجد علی شیدا صاحب فارسی پڑھاتے تھے۔ وہ بھی بہت سنجیدہ تھے۔ یہ دونوں بزرگ سنٹو ڈمی میں رہتے تھے۔ ان میں سے ایک وہاں کے وارڈن تھے۔ ان کے اعزا کراچی میں ہیں۔

اشفاق صاحب میٹرک پاس کرنے کے بعد جب گیارھویں جماعت میں داخلہ لیا تو قیام کے لیے بعض احباب کی وجہ سے

---

① حیدرآباد دکن کی شیروانی میں آستینوں کا سرا ڈبل ہوتا تھا۔ شیروانی کی لمبائی زیادہ ہوتی تھی۔ بھوپال کی شیروانی کی لمبائی گھٹنوں تک ہوتی تھی اور علی گڑھ کی شیروانی کی لمبائی درمیانی ہوتی تھی۔

مزمّل ہوسٹل منتخب کیا۔ وہاں کمرہ نمبر ۳۳ میں رہتا تھا۔ میرے ساتھ میرے پرانے دوست اور مشہور کھلاڑی عبدالحی اور اُن کے عزیز سراج الحق بھی رہتے تھے۔ ہماری کلاسیں منٹو ہال کی بالائی منزل میں ہوا کرتی تھیں۔ انگریزی جناب سید ولی محمد صاحب پڑھاتے تھے۔ بہت محنت اور محبت سے، پڑھاتے تھے۔ نواب وقار الملک کے صاحبزادے اشفاق صاحب گو بی اے (آنرس) تھے لیکن ہمیشہ شیروانی پہنتے اور طلبہ کو پہلے ہی سلام کرتے تھے۔ شرافت، شفقت اور ذہانت کا مجسمہ تھے۔ اور بڑی محنت سے پڑھاتے تھے۔ عبدالشکور صاحب بھی انگریزی پڑھاتے تھے لیکن ہم لوگوں کو معلوم نہیں اُن کے لیکچر کے وقت نیند آنے لگتی تھی۔ ہمّت علی صاحب چھوٹے سے قد کے تھے۔ بہت تیزی سے بات کرتے تھے اور ہمیشہ سوٹ پہنتے تھے۔ طلبہ اُن کو Ace Courage کہا کرتے تھے۔

محمد حنیف صاحب

جغرافیہ جناب محمد حنیف صاحب پڑھایا کرتے تھے۔ وہ شہر کے بالائی قلعہ سے آیا کرتے تھے۔ Clarendon کے جغرافیہ کے دو حصے پڑھاتے تھے۔ کبھی کبھی کسی دینی بات کے متعلق مجھ سے تصدیق کرا لیتے تھے اور بڑے خوش اخلاق تھے۔ دُبلے پتلے لیکن اخلاق میں وزنی۔ جناب ابرار حسین فاروقی صاحب اور عبدالعزیز بجنوری صاحب تاریخ پڑھاتے تھے۔

محمد حاذق صاحب

فارسی جناب محمد حاذق صاحب "خوش باش"، "زندہ دل" اور علی گڑھ کے ایسے سپوت جن کے ہر قول اور ہر فعل سے علی گڑھ والوں کی صحیح نمائندگی ہوتی تھی۔ میرے محبوب اُستاد قبلہ ضیاء احمد بدایونی صاحب بھی فارسی پڑھاتے تھے لیکن

وہ بیک وقت عربی، فارسی، اردو تینوں زبانوں کے بہت بلند پایہ اُستاد تھے۔ اُن کے احسانات فراموش نہیں ہو سکتے۔ اردو جناب خاوری صاحب پڑھاتے تھے۔ بہت زیادہ لطافت پسند اور بذلہ سنج تھے۔ بشریر لڑکے اُن کے سامنے شرمندہ ہو جاتے تھے۔ ایک مرتبہ ایک طالب علم نے پڑھائی کو ٹالنے کے لیے کہا کہ جناب آج تو بہت گرمی ہے۔ خاوری صاحب نے برجستہ کہا کہ ایسی گرمی اس لیے ہے کہ پھر دوزخ میں تم کو زیادہ گرمی محسوس نہ ہو۔ وہ شرمندہ ہو کر چُپ رہا۔

مولانا احسن مارہروی صاحب

مولانا احسن مارہروی صاحب کو بھی بعض لڑکے اسی طرح چھیڑتے تھے۔ ایک طالب علم بہت شریر تھا (اللہ اُس کی مغفرت فرمائے)۔ وہ کچھ نہ کچھ فضول بات کرتا تھا، پھر شرمندہ ہو جاتا تھا۔ مولانا احسن الفاظ کی تحقیق اور اُن کے استعمال کے مواقع بڑی خوبی سے سمجھاتے تھے اور اشعار کی زبان و بیان سے اُن کے زمانے کی تعیین بھی سمجھاتے تھے اور یہ اُن کے کمال کی بڑی خصوصیت تھی۔ اُن کے ذوقِ شعری کی وجہ سے انٹرمیڈیٹ کالج میں ہر سال عظیم الشان مشاعرہ ہُوا کرتا تھا اور پورے ملک سے چوٹی کے شعراء شرکت کرتے تھے۔ بعض شہرت پسند شعراء بھی آجاتے تھے جن کا دماغ بھی درست کر دیا جاتا تھا۔ طلبہ میں شعر و سخن کا ذوق پیدا کرنے کے لیے مولانا اکثر "طرحی" مشاعرے بھی منعقد کراتے تھے۔ پھر ۸ دسمبر ۱۹۲۱ء کو انھوں نے ایک "تمثیلی" مشاعرہ منعقد کیا یعنی اس مشاعرے کی نقل جو ۱۲۹۵ھ / ۱۸۷۸ء میں رام پور میں وہاں کے والی نواب کلب علی خان کی نگرانی میں ہُوا تھا۔ اور میر مشاعرہ امیر مینائی

جو نواب صاحب کے اُستاد تھے۔ اصل مشاعرے کے شرکاء یہ تھے:
نواب محمد کلب علی خان نواب (م ۱۳۰۴ھ / ۱۸۸۷ء)۔ امیر مینائی (م ۱۳۱۸ھ / ۱۹۰۰ء) شمس العلماء مولوی عبد الحق منطقی خیر آبادی (م ۱۳۱۶ھ / ۱۸۹۹ء)۔ محمد شاہ خان (رام پوری) کاوش۔ حافظ محمد احمد قمر (خلف امیر مینائی) نعیم احمد خان سحاب۔ خواجہ ارشد علی خان قلق۔ محمود علی خان محمود۔ آغا علی نقی غنی لکھنوی۔ احسان علی خان احسان۔ محمد بشیر خان بشیر۔ شیخ امداد علی بحر لکھنوی۔ امراؤ مرزا نادان۔ میر قطب الدین اشک۔ منشی امیر اللہ تسلیم لکھنوی۔ سید مظفر علی اسیر۔ منشی احمد حسین خان عروج۔ صاحب عالم مرزا رحیم الدین حیا۔ آغا مرزا شاغل۔ سید محمد اسمٰعیل حسین، منیر شکوہ آبادی۔ حکیم میر ضامن علی جلال لکھنوی۔ نواب مرزا خان داغ (م ۱۳۲۲ھ / ۱۹۰۴ء)۔ ان سب شعراء کی وضع قطع، نشست و برخاست، انداز تکلم کی نقل طلبہ نے اتاری۔ خاص طور پر مرزا رحیم الدین حیا کی غزل طاہر حسین زبیری نے بوڑھے پن سے پڑھی جس کی وجہ سے اُن کو پہلا انعام ملا۔ یہ سب روئداد انٹرمیڈیٹ کالج میگزین (اپریل ۱۹۳۰ء) میں شائع ہوئی اور مولانا احسن کے حسنِ انتظام کی وجہ سے اس مشاعرے کی بڑی شہرت ہوئی۔ (۱)

شیخ علی جواد صاحب

دینیات شیخ علی جواد صاحب پڑھاتے تھے۔ میٹرک میں بھی انھی نے دینیات پڑھائی تھی۔ اس زمانے میں اُن کی داڑھی نہیں تھی۔ سنا ہے کہ بعد میں رکھ

---

(۱) مولانا احسن کے متعلق راقم الحروف نے کتاب طوبیٰ العلم میں تفصیل سے عرض کیا ہے۔

لی تھی۔ وہ داہنے اور بائیں ہاتھ سے بلا تکان لکھ لیتے تھے۔ اُن کی دو باتیں اب تک یاد ہیں۔ فرماتے تھے کہ امام ابو حنیفہؒ کے نزدیک جمعہ کا خطبہ غیر زبانِ عربی میں جائز ہے۔ دوسری بات یہ کہ رفیع سبابہ کا کوئی ذکر بخاری شریف میں نہیں ہے۔ شیخ صاحب پانچوں نمازیں جماعت کے ساتھ ادا کرتے تھے۔ انھوں نے مجھے نماز کا ماضیر بنا دیا تھا۔

مولوی مٹکا

اکثر طلبہ نمازی تھے۔ دینیات کے دوسرے اُستاد جن کا نام یاد نہیں لیکن اُن کی عرفیت "مولوی مٹکا" تھی۔ بہت دلچسپ شخصیت کے مالک تھے۔ ابھی ۵۔۶ سال ہوئے اُن کے صاحب زادے مجھ سے ملنے آئے تو انھوں نے اپنی شناخت اسی طرح کرائی کہ میں "مولوی مٹکا" کا بیٹا ہوں۔ مولوی صاحب کے علم و فضل اور اُن کی تو ندکے "گنجہائے گراں مایہ" کا صحیح اندازہ ہم لوگوں کو کبھی نہیں ہو سکا۔ لیکن اُن کی دلچسپ باتوں سے اُن کا گھنٹہ آسانی سے ختم ہو جاتا تھا۔ ایک دن فرمانے لگے کہ میں حج کے لیے گیا تھا تو وہاں ایک شادی کی بڑی دھوم مچی ہوئی تھی۔ میں نے پوچھا کہ کیا بات ہے؟۔ معلوم ہوا کہ جس لڑکی کی شادی ہو رہی ہے وہ بہت خوب صورت ہے۔ میں نے کہا کہ کیا میں اس لڑکی کو دیکھ سکتا ہوں۔ لڑکی والوں نے کہا کہ ہاں آپ دیکھ سکتے ہیں۔ میں نے دیکھا تو وہ ناک کی بالکل چپٹی تھی۔ اور یہی اس کا حسن تھا۔ مولوی مٹکا صاحب ایسی باتیں ایسے زور شور سے بیان فرماتے کہ کسی کمرے میں تک پڑھنے پڑھانے کی ضرورت باقی نہیں رہتی تھی۔

سنہ ۱۹۳۱ء میں انٹرمیڈیٹ کا امتحان اچھے نمبروں سے پاس کر کے یونی ورسٹی میں داخلہ لیا اور ایس ایس ویسٹ کے آخری کمرے سے پہلے والے کمرے میں قیام کیا۔ میرے ساتھ سید محمد صاحب (مراد آبادی) تھے۔ پاگل

کے اچھے کھلاڑی اور ۸ - ۹ میل روز دوڑ لگاتے تھے۔ یہاں پاکستان میں ٹریفک پولس کے سب سے بڑے افسر ہو کر ریٹائر ہوتے ہیں۔ انھی کے چھوٹے بھائی سید حامد صاحب علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے وائس چانسلر رہ چکے ہیں۔ چند ماہ تک سید محمد صاحب کے ساتھ اُس کمرے میں قیام رہا پھر دو ایک دن عبدالرشید صاحب نے وہ کمرہ ایک صاحب کے لیے خالی کرالیا، تاکہ وہ کمرے کی پشت کی جالی سے کرکٹ کا کھیل بیٹھے بیٹھے دیکھ سکیں۔ سید محمد صاحب وہاں سے کمرہ نمبر ۴۴ میں چلے گئے اور راقم الحروف عثمانیہ ہوسٹل کے کمرہ نمبر ۲ میں چلا گیا۔

مختار حامد علی صاحب

بی اے کلاس میں مختار حامد علی صاحب انگریزی کے سب سے زیادہ محنتی اُستاد تھے۔ پہلے سال کی انگریزی اور دوسرے سال کی انگریزی (شیکسپیر کے دو ڈرامے اور جدید انگریزی شعراء کا انتخاب دو حصوں میں) انھی کے ذمے تھے۔ ٹھہر ٹھہر کر اور پورے اعتماد کے ساتھ انگریزی بولتے تھے۔ سخت محنت کی وجہ سے منہ میں ایک طرف جھاگ آ جاتا تھا۔ THOMAS HARDY سے انھیں شغف تھا اور انھی کی وجہ سے ہم میں سے اکثر طلبہ نے اس مصنف کی تمام کتابیں پڑھ ڈالی تھیں وہ اُسے PROSE DRAMATIST کہا کرتے تھے۔ مجھ پر بڑی شفقت فرماتے تھے اور اپنی ٹیوٹوریل کلاس میں انھوں نے خصوصی طور پر مجھے شامل کیا تھا۔ نہایت سنجیدہ اور باوقار تھے۔ ایک مرتبہ انگریزی کے اُستاد غلام سرور صاحب ایک مقالہ پڑھنے والے تھے۔ سمجھنے والا کوئی نہ تھا۔ مختار حامد علی صاحب نے مجھے بُلایا اور فرمایا لڑکوں کو پکڑ لاؤ۔ میں رات سے دوستوں کو لے آیا۔ غلام سرور صاحب کی تقریر جب ختم

جوئی تو شعبۂ انگریزی کے صدر HADOW HARRIS تبصرہ کرنے کے لیے کھڑے ہوئے۔ اُن کے ہر جملے پر مختار حامد علی صاحب قہقہہ لگاتے تھے اور اُن کی انگریزی کا مذاق اُڑاتے تھے۔ میں نے پہلی بار اُن کو قہقہہ لگاتے دیکھا تھا۔

قاری محمود حسین صاحب، دُراب جی

انگریزی کے دوسرے اُستاد محمود حسین صاحب تھے۔ وہ بعض حروف حلق سے ادا کرتے تھے۔ تو لڑکوں نے اُن کا نام قاری محمود حسین رکھ لیا تھا۔ وہ عموماً GOLDEN TREASURY پڑھاتے تھے۔ تیسرے اُستاد دُراب جی (پارسی) تھے۔ وہ GALSWORTHY کا ڈراما پڑھاتے تھے۔ بہت نرم طبیعت کے تھے۔ وہ فرماتے تھے کہ کسی کو بُرا مت کہو۔ اگر بُرا کہنا ہی پڑے تو صرف یہ کہو کہ وہ اچھا نہیں ہے۔

میرے بزرگ اُستاد ضیاء احمد بدایونی صاحب اب بی اے کی درسی نثر و نظم پڑھانے لگے تھے۔ ایک ایک لفظ کی تحقیق اور اُس کے استعمال کا طریقہ سمجھاتے تھے۔ جدید فارسی کی نظم و نثر کا مجموعہ بھی اُنھی کے ذمے تھا۔ اُس زمانے میں نویں جماعت سے ذریعۂ تعلیم (ہر مضمون کے لیے) انگریزی ہی تھا۔ ہمارے ضیاء احمد صاحب بہت اچھے انگریزی مترادفات بتاتے تھے۔

ڈاکٹر عباد الرحمٰن صاحب

ڈاکٹر عباد الرحمٰن صاحب کے آجانے سے شعبۂ جغرافیہ کو بہت فروغ ہوا۔ بکثرت طلبہ نے داخلہ لیا اور دور دور سے آنے والوں کا ہجوم لگ گیا۔ پھر تو دھوتی ہوسٹل (یعنی ڈیوڈ سوسائٹی ہوسٹل) میں بہت سی دھوتیاں سوکھتی ہوئی دکھائی دینے لگیں۔ ①

---

① سوہن لال کا جغرافیہ بہت مقبول تھا۔ میں نے بھی وہ کتاب (بقیہ اگلے صفحے پر)

میرا ایک مضمون تاریخ تھا۔ پروفیسر عبدالرشید صاحب بہت تیاری کرکے آتے تھے۔ عبدالحلیم جنگالی صاحب تاریخ کی صرف نیوٹوریل کلاس لیا کرتے تھے۔ علی گڑھ میں اُس وقت بعض مشہور اساتذہ اس مضمون کے لیے موجود تھے لیکن ان کا مطالعہ صرف انگریزی کتابوں تک محدود تھا۔ حالانکہ اسلام اور مسلمانوں کی تاریخ کے لیے عربی اور فارسی کی اعلیٰ قابلیت بہت ضروری ہے۔ ورنہ بہت سی غلطیاں ہو جاتی ہیں جو بعض ایسی کتابوں میں نظر آتی ہیں جو اُس زمانے میں شایع ہوئی ہیں۔

قاری ضیاء الدین احمد صاحب

اوپر عرض کیا گیا کہ راقم الحروف مخانیہ ہاسٹل آگیا تھا۔ وہاں آتے ہی اللہ کی طرف سے مجھے دو انعام حاصل ہوتے یعنی دو مشہور بزرگوں کی خدمت میں حاضری نصیب ہوئی۔ ایک قاری ضیاء الدین احمد صاحبؒ (م ۱۳۷۱ھ / ۱۹۵۲ء) تھے اور دوسرے حضرت مولانا سلیمان اشرف صاحبؒ (م ۱۳۵۸ھ / ۱۹۳۹ء)۔ حضرت قاری ضیاء الدین احمد صاحب نے حضرت قاری عبدالرحمٰن مکی علیہ الرحمۃ (م ۱۳۴۹ھ) سے قراءاتِ عشرہ تک کی تکمیل کی تھی۔ امروہہ، کانپور، لکھنؤ، جونپور، الٰہ آباد وغیرہ میں برسوں تعلیم دی تھی اور ہندوستان کے اکثر قراء اُن کے شاگرد تھے یا شاگرد در شاگرد تھے۔ عربی نظم و نثر بلا تکلف لکھتے تھے۔ عربی نظم میں اُن کی کتاب خلاصۃ البیان (علم تجوید پر) قریب ۲۸ سال کی عمر میں تیار ہوئی تھی۔ اس کے علاوہ کئی تصانیف ہیں۔ اردو میں ضیاء القراءت بہت مشہور و مقبول ہے۔ اُن کے علم و فضل اور زہد و تقویٰ کی وجہ سے حضرت مولانا شبیر احمد

(بقیہ حاشیہ گذشتہ صفحہ سے) پڑھی تھی لیکن سوہن لال جب جوائنٹ میں آئے تو امتحان دینے نہ آئے تو فیل کیے گئے۔

عثمانی صاحب علیہ الرحمہ (م ۱۳۶۹ھ) کی دستار بندی اُن سے کرائی گئی تھی۔

حضرت قاری عبدالرحمٰن مکی علیہ الرحمہ (م ۱۳۴۹ھ) کے انتقال کے بعد وہ مسلم یونیورسٹی میں اُستاذِ تجوید و قراءت مقرر کیے گئے۔ راقم الحروف کی خوش نصیبی ہے کہ یونیورسٹی میں سب سے پہلے روایتِ حفصؒ کی سند اُنھوں نے مجھی کو عنایت فرمائی۔ اور حضرت مولانا ابوبکر محمد شیث جونپوری علیہ الرحمہ (م ۱۳۶۹ھ/۱۹۵۰ء) نے جو ناظم دینیات تھے میری سند کی تصدیق فرمائی۔ اُسی زمانے میں قاری صاحب نے مجھ سے فرمایا تھا کہ میں ان شاء اللہ تم کو شاطبی شریف پڑھاؤں گا۔ میری نوعمری تھی۔ اُس کی اہمیت سے واقفیت نہیں تھی۔ ۱۹۴۳ء میں علی گڑھ سے وطن واپس ہوا۔ پھر کنگ ایڈورڈ کالج۔ امراؤتی (برار) میں اردو کا اُستاد مقرر ہوا۔ تو حضرت قاری صاحب کو اپنا وعدہ یاد آیا۔ یعنی تنہا ان چاہے کے پاس پہنچا اور آپ قریب ستّر سال کی عمر میں اور قریب ایک ہزار میل کا سفر طے کرتے ہوئے تنہا ۱۹۴۴ء میں امراؤتی پہنچے۔ اور پندرہ دن میں (بہر فرصت میں) دن رات شاطبی شریف وغیرہ کئی کتابیں پڑھائیں۔ میں نے اپنی عمر میں ایسے شفیق، کم سخن، عبادت گزار اور باکمال بزرگ بہت کم دیکھے ہیں۔ اللہ تعالیٰ اُن پر لاکھوں کروڑوں رحمتیں ہر وقت نازل فرماتا رہے۔ آمین ثم آمین۔

مولانا سلیمان اشرف صاحب

دوسرے باکمال بزرگ جن سے شرفِ تلمذ حاصل ہوا، وہ حضرت مولانا سلیمان اشرف علیہ الرحمہ (م ۱۳۵۸ھ/۱۹۳۹ء) تھے۔ وہ عصر کے بعد یونیورسٹی کی مسجد میں تفسیر پڑھاتے تھے اور ہفتے میں ۲-۳ دن مغرب کے بعد بخاری شریف بھی پڑھاتے تھے۔ میں حاضر ہوا تو فرمایا کہ "تو کہاں سے آیا ہے؟" میں نے عرض کیا کہ "جبل پور سے"۔ فرمایا کہ "وہاں میرا ایک دوست

عبدالسلام رہتا ہے۔ کیا تو اُسے جانتا ہے ؟"۔ میں نے عرض کیا کہ" وہ تو میرے مخدوم ہیں"۔ فرمایا" اب تو وہاں جائے تو میرا سلام کہنا"۔ میں نے عرض کیا کہ" انشاء اللہ عرض کر دوں گا"۔ چنانچہ تعطیل میں جب وطن گیا تو مولانا کا سلام اُن کے دوست سے عرض کر دیا۔ وہ بہت خوش ہوئے اور انھوں نے بھی سلام عرض کرنے کے لیے فرمایا۔ پھر میں جب تفسیر کلاس میں شریک ہوا تو اُس وقت مولانا (غالباً) سورۃ الشعراء پڑھا رہے تھے۔ جب اُس سورۃ کی آیت نمبر (۲۰) کا لفظ" ضالین" آیا تو مولانا ہم لوگوں سے فرداً فرداً" اس لفظ کے معنی پوچھنے لگے کہ" تو بتا، تو بتا"۔

سب لڑکے چُپ تھے۔ میں نے عرض کیا کہ اس لفظ کے معنی" گمراہ لوگوں" کے ہیں۔ مولانا نے گرج کر فرمایا" چُپ رہے، نالائق"۔ میں لرز گیا اور مسجد گو نج گئی۔ خیر۔ بات ختم ہو گئی اور میں برابر تفسیر کلاس میں شریک ہوتا رہا اور ایک زمانہ گزر گیا۔ تفسیر پڑھانے کا طریقہ وہاں یہ تھا کہ ایک طالب علم ایک دو رکوع کا ترجمہ پڑھ کر آتا تھا۔ وہ ترجمہ کرتا تو مولانا تفسیر فرما دیتے تھے۔ بیان بہت مدلل ہوتا تھا اور ہم لوگوں کی غلطی کی برملا اصلاح فرما دیتے تھے۔

ایک مرتبہ پڑھاتے ہوئے فرمایا کہ" جس پانی کا رنگ اور مزہ بدل جائے اُس سے وضو جائز نہیں۔ میں نے عرض کیا کہ پانی میں چُنا س ملانے سے پانی کا رنگ اور مزہ بدل جاتا ہے تو کیا ایسے پانی سے وضو جائز نہیں ؟"

مولانا ایک لمحے تک خاموش رہے۔ لیکن پھر فرمایا کہ" نہیں۔ ایسے پانی سے وضو جائز ہے"۔ (میں سمجھ رہا تھا کہ شاید پھر ڈانٹ پڑے گی۔ لیکن پھر یہ اعزاز نہیں ملا)۔

مولانا حسین و جمیل، خوش پوش اور جامہ زیب تھے۔ علی گڑھ کٹ

پاجامے سے ذرا زیادہ ڈھیلا پاجامہ ہوتا تھا۔ ڈھیلا کُرتہ اور عموماً اعلیٰ کپڑے کی شیروانی ہوتی تھی۔ بڑا رومال، سرخ اور سیاہ پھولوں والا ہوتا تھا۔ سر پر عموماً لکھنؤی سفید ٹوپی یا عمامہ (عموماً ہلکے بادامی رنگ کا) ہوتا تھا۔ اعضا متوازن تھے۔ آنکھوں میں سُرخ ڈورے تھے۔ ہتھیلیوں کی لکیریں لمبی اور بہت نمایاں تھیں۔

علی گڑھ کی معاشرتی زندگی میں ایک خوبی یہ بھی تھی کہ وہاں دیوبندی اور بریلوی، شیعہ اور سنّی جیسی کوئی تفریق نہیں تھی۔ مولانا گو کہ بریلوی مسلک کے تھے اور حضرت مولانا احمد رضا خان صاحب علیہ الرحمہ (م ۱۳۴۰ھ) کے خلیفہ تھے۔ لیکن ہمیشہ مولانا ابوبکر محمد شیث جونپوری صاحب کے پیچھے نماز پڑھا کرتے تھے۔ حالانکہ وہ دیوبندی تھے۔ اقامت شروع ہوتے ہی مولانا نماز کے لیے کھڑے ہو جاتے تھے۔ یعنی حیّ علی الصلوٰۃ سُن کر کھڑے نہیں ہوتے تھے۔ انھوں نے کبھی نہیں کہا کہ جمعہ کے خطبہ کی اذان باہر ہونی چاہیے۔ انھوں نے اور اُن کے کسی پیر بھائی نے کبھی نہیں کہا کہ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم حاضر و ناظر ہیں ① اور میلاد شریف جب بھی پڑھا جائے تشریف لے آتے ہیں۔ آج کل کے

---

① راقم الحروف کئی مرتبہ مدینہ منورہ میں مولانا احمد رضا خان صاحبؒ کے خلیفہ مولانا ضیاء الدین صاحب (م ۱۴۰۱ھ) کی خدمت میں حاضر ہوا ہے۔ غالباً ۱۳۹۲ھ/۱۹۷۲ء میں اُن کی خدمت میں فیصل آباد کے ایک بھاری بھر کم مولانا بیٹھے ہوئے تھے۔ انھوں نے مولانا ضیاء الدین صاحب سے دریافت کیا کہ تشہّد میں السلام علیک ایھا النبی ہے۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم حاضر و ناظر ہیں۔ مولانا نے غالباً اُن کی دلجوئی کے لیے (ہاں کہنے کے واسطے) سر ہلا دیا۔ (بقیہ اگلے صفحہ پر)

بریلویوں نے "حاضر و ناظر" کے مسئلے پر بہت زور دے رکھا ہے۔ اور اب جماعت کے وقت امام مصلّے پر بیٹھ جاتا ہے اور جب تکبیر کے وقت اشہد ان لا الٰہ الا اللہ اور اشہد ان محمد رسول اللہ کہا جاتا ہے تو دونوں اشہد کے وقت رفع سبابہ کرتا ہے اور جو نہ کرے اُسے کافر سمجھتا ہے۔ ہمارے مولانا ان تمام باتوں کے خلاف تھے۔ البتہ اشہد ان محمد رسول اللہ سن کر دونوں انگوٹھوں کے پاس کی انگلیاں لبوں پر لگا کر (چوم کر) آنکھوں سے لگا لیتے تھے۔ اور انھوں نے کبھی کسی کو کافر نہیں کہا۔

راقم حروف ۱۹۳۶ء میں علی گڑھ سے فارغ ہوا۔ پھر کنگ ایڈورڈ کالج امراؤتی (برار) میں اردو کا اُستاد مقرر ہوا۔ اپریل ۱۹۳۹ء میں حیدر آباد (دکن) گیا ہوا تھا تو ریڈیو سے خبر سنی کہ حضرت مولانا سلیمان اشرف صاحب ۲۵ اپریل ۱۹۳۹ء (سہ شنبہ ۵ ربیع الاول ۱۳۵۸ھ) کو اللہ کو پیارے ہو گئے۔ تین رات مسلسل مجھے خواب میں عزت بخشی۔ تیسری رات کو خواب ہی میں مجھے خیال آیا کہ مجھے ڈانٹا تھا۔ شاید اسی وجہ سے مسلسل تشریف لا رہے ہیں۔ میں نے عرض کیا کہ آپ تو میرے اُستاد ہیں اور والدین کی طرح شفقت فرماتے ہیں، آپ کوئی خیال نہ فرمائیں۔ اس کے بعد پھر وہ خواب میں تشریف نہیں لائے۔ لیکن۔ ع ما بے تو در غمیم تو بے ما چگونۂ

رشید احمد صدیقی صاحب | بی اے کی لازمی اردو پروفیسر رشید احمد صدیقی صاحب پڑھاتے تھے۔

(بقیہ حاشیہ گزشتہ سے پیوستہ) اس کے بعد سے حاضر و ناظر کا مسئلہ پاکستان میں بہت زور شور سے اُٹھایا جا رہا ہے۔ حالانکہ شیخ عبدالحق محدث دہلویؒ (م ۱۰۵۲ھ) نے بھی اپنے مکتوب نمبر ۳۸ میں اس عقیدے کی تردید فرمائی ہے۔

دیوانِ غالب۔ نشاطِ روح (اصغر) اور مقدمۂ شعر و شاعری (حالی) بہت خوب پڑھاتے تھے۔ کلاس بہت بڑی تھی۔ لیکن چوں کہ وہ خود علی گڑھ کے مایۂ ناز طالبِ علم رہ چکے تھے اس لیے اپنی بذلہ سنجی سے شریر طلبہ کو بھی ایک آدھ جملے سے خاموش کر دیتے تھے۔ خوش باش، خوش کلام اور خوش اوقات تھے۔ اُن کی شفقت سے بعض طلبہ کو اپنے متعلق غلط فہمی پیدا ہو جاتی تھی چنانچہ بعد میں بعض نے احسان فراموشی بھی کی ہے۔

——— بعض غیر ملکی اساتذہ ———

علی گڑھ میں سر سید کے پوتے سر راس مسعود جب ۲۰ر اکتوبر ۱۹۲۹ء سے یکم اکتوبر ۱۹۳۴ء تک وائس چانسلر رہے۔ انھوں نے کسی مصلحت کی بنا پر غیر ملکی اساتذہ کو یونی ورسٹی میں جگہ دی۔ حتیٰ کہ شعبۂ عربی میں جرمنی کے Dr. Otto Spies کو لے لیا۔① وہ بے شک قابل اور بہت ملنسار تھے۔ لیکن ان سے زیادہ قابل حضرات اس شعبے میں موجود تھے۔ اسی طرح یونی ورسٹی اسکول میں باہر سے درآمد کیے جانے والے G. C. Woods پرنسپل بنائے گئے۔ وہ اپنی حرکات و سکنات

---

① محمد یوسف صاحب (راولپنڈی چھاؤنی) ماشاء اللہ ۹۵ سال کے ہیں اور توانا اور ذہین سب سے پرانے علیگ ہیں۔ انھوں نے ۱۱- جولائی ۱۹۹۲ء کو مجھے لکھا کہ جب علی گڑھ میں ایک جرمن فوت ہو گیا تو اُس کی جگہ دوسرا جرمن جناب راس مسعود صاحب نے بُلا لیا۔ پھر ڈاکٹر احسان حقی صاحب نے (جو عربی کے پروفیسر تھے) بطور Protest کے ملازمت چھوڑ دی اور دمشق واپس چلے گئے۔

سے بھی جنگل کے آدمی معلوم ہوتے تھے ۔ لوگوں نے اُن کو تماشا بنا لیا تھا ۔

۱۹۳۲ء میں کتاب "انگارے" شایع ہوئی تو علی گڑھ شہر سے ایک ہفت روزہ یا چندروزہ اخبار "خشّاف" کے نام سے جاری ہوا ۔ (اس کے محرر غالباً وحید اللہ آزاد اور مولانا ابرار حسین فاروقی تھے)۔ اخبار کا نام "خان بہادر شمس العلماء مولانا ابو الفداء" کے ہر پہلے حرف کا مجموعہ تھا ۔ اس میں ایک مستقل باب "آگ کھائیں انگارے ہگیں" ہوا کرتا تھا ۔ دہریت کے لیے جو نیا نیا شوق پیدا ہوا تھا اور صرف بے حیائی والے افسانوں کو شایع کرنا Realism کہا گیا تھا ۔ اُس کے خلاف اس اخبار میں مضامین شایع ہوا کرتے تھے ۔ یونی ورسٹی میں شعبۂ فلسفہ کے صدر ڈاکٹر سید ظفر الحسن صاحب اس نئے شوق کے سخت خلاف تھے ۔ انھوں نے REALISM کے نام سے ایک کتاب لکھی جو کیمبرج یونی ورسٹی پریس نے شایع کی ۔ آکسفورڈ اور کیمبرج یونی ورسٹیوں میں وہ کتاب "بطور حوالہ" داخل نصاب تھی ۔ کچھ قسم کے نوجوان اس کتاب کو اپنے لیے زہر سمجھتے تھے اور ڈاکٹر صاحب موصوف کی "اسلام دوستی" سے پریشان تھے ۔ ڈاکٹر صاحب سے میرا تعلق بھائی عبد الحمید جالندھری کی وجہ سے ہوا تھا کہ وہ اُن کے شاگرد تھے ۔ ڈاکٹر صاحب فرمایا کرتے تھے کہ ایسے لوگوں سے بحث و مباحثہ کے لیے میں حاضر ہوں لیکن تم لوگ ان کی خیریت پوچھ لیا کرو ۔ چنانچہ ایک صاحب کی خیریت میں نے بھی پوچھ لی تھی ۔ اُس سے اُن کے دماغ کی فوراً اصلاح ہوگئی تھی ۔ ڈاکٹر صاحب بہت خوب صورت اور خوب سیرت تھے ۔ اُن کی داڑھی بھی بہت خوب صورت تھی ۔ طلبہ کو شوق دلانے کے لیے اپنے بنگلے پر خوش سکھانے کا انتظام کیا تھا ۔ انھیں کیا معلوم تھا کہ ایک زمانہ ایسا آنے والا

۵۹ جیسے کہ زمانے کے لوگ بھی چھپ کر کلاشنکوف سے بے قصور لوگوں کو مارنا بہادری سمجھیں گے۔

ڈاکٹر ہادی حسن صاحب

بی اے اچھے نمبروں سے پاس کرنے کے بعد ڈاکٹر ہادی حسن صاحب کی شخصیت سے متأثر ہو کر میں نے ایم اے (فارسی) میں داخلہ لے لیا۔ ڈاکٹر صاحب نہایت حسین و جمیل۔ نازک اندام اور نازک مزاج تھے۔ ایرانی النسل ہونے کی وجہ سے "حسنِ طبیعت" کا مجسمہ تھے۔ غیر معمولی ذہین، انگریزی اور جدید فارسی کے بلند پایہ فاضل اور بہترین مقرر تھے۔

غلام السیدین صاحب جو بی ٹی کالج کے پرنسپل اور خود بھی بہت اچھے مقرر تھے وہ ڈاکٹر صاحب کو STAGE DRAMATIST کہا کرتے تھے۔ جو شخص انگریزی یا فارسی نہیں سمجھتا تھا وہ بھی مسحور ہو جاتا تھا۔ لندن میں DUKE OF WINDSOR کے ہم جماعت تھے۔ پروفیسر براؤن سے بہت مستفیض ہوئے۔ فرماتے تھے کہ پروفیسر براؤن کہا کرتے تھے کہ دنیا میں صرف عربی اور لاطینی کو اُمّ الالسنہ کہنا چاہیے۔ ڈاکٹر صاحب نے کئی فاضلانہ کتابیں یادگار چھوڑی ہیں۔ بڑی بڑی کتابیں بہت جلد یاد کر لیتے تھے۔ اور اپنی تقریر میں نثر کی عبارتیں ایسی خوبی کے ساتھ ضم کر لیتے تھے کہ حیرت ہوتی تھی۔ F. W. BAIN کی عبارتیں انہیں بہت پسند تھیں۔ مجھ سے ایک مرتبہ فرمانے لگے کہ تم بھی ایسی عبارتیں یاد کر لیا کرو ـــ میں نے عرض کیا کہ آپ بھی ایسی عبارتوں کے بجائے قرآن پاک کیوں حفظ نہیں کر لیتے؟ انہوں نے برجستہ کہا کہ میں نے ایک تہائی قرآن حفظ کر لیا ہے۔ ایک مرتبہ فرمانے لگے کہ تم دولت شاہ کے تذکرے کا انگریزی ترجمہ کر ڈالو

چند روز میں اُس کی نثر کا انگریزی نثر میں اور اُس کے اشعار کا انگریزی اشعار میں ترجمہ (نسخ کے قریب) کرکے اُن کی خدمت میں پیش کیا۔ بہت خوش ہوئے اور عرصے تک اپنے پاس رکھا۔ ڈاکٹر صاحب بار بار ایران جاتے رہتے تھے اور وہاں کی زبان اور معاشرے سے متأثر ہوکر آتے تھے۔ خوش اخلاق ایسے تھے کہ انکار کا لفظ اُن کی زبان سے کبھی ادا نہیں ہوتا تھا۔ اُن کی ذاتی زندگی کے واقعات اسی انکار کے نہ ہونے کی داستان تھے۔ اُن کے صبر و تحمل سے متعلق بہت سی باتیں ہیں جن کا اجر اللہ تعالیٰ ہی دے سکتا ہے۔ اللہ تعالیٰ اُن کے درجات خوب خوب بلند فرمائے۔ آمین۔ ثم آمین۔

حاجی حمید الدین صاحب

شعبۂ فارسی کے دوسرے اُستاد لفٹننٹ حاجی حمید الدین صاحب تھے۔ وقت کے سخت پابند۔ پڑھائی کا گھنٹہ شروع ہوتے ہی فوراً پڑھائی شروع کر دیتے تھے اور گھنٹہ ختم ہوتے ہی فوراً پڑھائی ختم کر دیتے تھے بلکہ جملہ بھی ادھورا چھوڑ دیتے تھے۔

ایک مرتبہ مجھ سے فرمایا کہ تم فلاں جگہ (غالباً) نو بجے مجھ سے ملنا۔ مجھے ۲-۳ منٹ کی دیر ہوگئی تو وہ وہاں صحیح وقت پر آکر جا چکے تھے۔ مجھ سے فرماتے تھے کہ تم لیڈر بننا (معلوم نہیں کیوں ایسا فرماتے تھے)۔ سن ۱۹۳۱ء میں جب کہ ہم لوگوں کا فاضل کا امتحان ہونے والا تھا وہ ریٹائر ہو گئے۔ فرمانے لگے کہ مجھے اپنے مضمون (فارسی) سے کوئی خاص دلچسپی نہیں تھی لیکن یہ حقیقت ہے کہ وہ بڑی محنت سے پڑھاتے تھے۔ اُن کو شکار کا بہت شوق تھا اور اُڑتے ہوئے پرندوں کا خوب نشانہ بناتے

تھے ۔ اپنے مکان کے ایک کونے میں انھوں نے مٹی کا ایک ڈھیر لگا دیا تھا اُس پر نشانے کی مشق کرتے رہتے تھے ۔ آخر وقت میں قرآن پاک کا انگریزی ترجمہ شروع کیا تھا ۔ لیکن پھر ضعف کی وجہ سے نہ کر سکے ۔

ضیاء احمد صاحب

شعبۂ فارسی کے تیسرے اُستاد فاضل یگانہ ضیاء احمد بدایونی صاحب تھے ۔ عربی ، فارسی ، اردو تینوں زبانوں اور ان کے ادب پر اتنا عبور تھا کہ خود ان مضامین کے اساتذہ اُن کے فضل و کمال کے معترف تھے ۔ بیماری کی حالت میں بھی وہ پابندی کے ساتھ پڑھاتے تھے اور مطبوعہ کتابوں کے الفاظ کی تصحیح فرما دیتے تھے ۔ پھر غلطیوں کی تحقیق کا شوق بھی پیدا کرتے تھے ۔ شعر و شاعری اُن کے گھر کی لونڈی تھی ۔ یعنی اُن کے گھر کے چھوٹے چھوٹے بچے بھی اچھا شعر کہہ لیتے تھے ۔ میں نے اُنھیں کے مشورے سے سید حسن غزنوی (م ۵۵۵ھ) پر کام کیا تھا اور اس سلسلے میں اُس کے متعدد معاصرین کے کم یاب کلام سے سلطان بہرام شاہ غزنوی کی تاریخ کے لیے اشارات جمع کیے تھے ۔

سید حسن کے عربی قصائد کی تصحیح (جس کے لیے ملک کے بڑے بڑے فضلاء نے معذرت کر لی تھی) صرف قبلہ ضیاء احمد صاحب کی وجہ سے ہو سکتی تھی ۔ اُن کا انگریزی اور اردو خط نہایت پاکیزہ تھا ۔ وہ روانی میں بھی پاکیزگی کو برقرار رکھتے تھے اور خود بھی بہت نستعلیق قسم کے بزرگ تھے ۔

ایک مرتبہ میں نے عرض کیا کہ فردوسی (= ۳۶۰) اور اُس کا شاہنامہ (= ۴۰۲) دونوں تاریخی معلوم ہوتے ہیں ، کیونکہ تاریخی شواہد سے ظاہر

ہوتا ہے کہ اُس نے سنہ ۱۳۲۶ھ میں شاعری شروع کی تھی اور سنہ ۱۳۳۲ھ میں اُس نے شاہ نامہ مکمل کیا تھا۔ قبلہ ضیاء احمد صاحب بہت خوش ہوئے۔ فرمایا، بیٹے، تم نے بات تو بہت اچھی کہی ہے۔ لیکن اس صدی میں ایسے تاریخی اصول کا رواج نہیں ملتا۔"

قبلہ ضیاء احمد صاحب کی شفقتیں مجھ پر ان کے آخری دم تک رہی ہیں اور میں بھی اُن کے درجات میں بلندی کے لیے دعا میں کبھی ناغہ نہیں کرتا۔

مولانا عبد الخالق صاحب

ایم اے کے ساتھ ایل ایل بی کلاس میں داخلہ لیا جا سکتا تھا اور اُس کے امتحان میں کم از کم پچاس فی صدی نمبر حاصل کرنے ضروری تھے۔ میں نے اور میرے چند خاص احباب نے بھی اس کلاس میں داخلہ لے لیا تھا، کیونکہ اس کی کلاسیں مغرب کے بعد ہوا کرتی تھیں۔ اس زمانے میں اس کے لیے تین استاد تھے۔ (۱) مولانا عبد الخالق صاحب (۲) بیرسٹر خسرو اسحٰق صاحب۔ اور تین (۳) بیرسٹر خسرو خواجہ اسحٰق صاحب۔

مولانا عبد الخالق صاحب بہت خاموش طبیعت تھے۔ پورے وقت میں سنجیدگی سے پڑھاتے تھے۔ شروع میں حاضری لیتے تھے اور طلبہ کی آواز پہچانتے تھے۔ اگر کسی طالب علم نے اپنے کسی غیر حاضر دوست کی حاضری کے لیے حاضر جناب کہہ دیا تو وہ پھر سے حاضری لینا شروع کرتے تھے۔ اس مرتبہ وہ بےچارہ اپنے دوست کی حاضری کے وقت چُپ ہو جاتا تھا۔ لیکن مولانا کچھ نہیں بولتے تھے۔ از راہِ شفقت انھوں نے مجھے بہت اچھا سرٹیفکیٹ عنایت فرمایا تھا جو ابھی تک محفوظ ہے۔ ان کی کوٹھی میرس روڈ میں مخدومی نواب حبیب الرحمٰن خان شیروانی صاحب کی کوٹھی کے مقابل تھی۔ سُنا ہے کہ

اب اُس روڈ کا نام مولانا عبدالخالق روڈ ہو گیا ہے۔

بیرسٹر خسرو اسحٰق صاحب

یونی ورسٹی کا علاقہ بہت وسیع تھا۔ جنوبی حصے میں مسلم یونی ورسٹی پریس اور دوسری سڑک پر اساتذہ کے بنگلے دور تک پھیلے ہوئے تھے۔ اس علاقے اور شہر کے درمیان حدِ فاصل کھٹہ پلا (لکڑی کا پل) اور ریلوے اسٹیشن ہی کو سمجھا جاتا تھا۔

کھٹہ پلے کا مشرقی حصہ ایک بزرگ برچھی بہادرؒ کے مزار کے قریب ختم ہوتا تھا اور اُس کے ساتھ ریلوے لائن تھی۔ اس پُل کا مغربی حصہ جہاں ختم ہوتا تھا اس کے آگے رسل گنج محلہ تھا۔ اُس کی سڑک بالکل سیدھی چلی جاتی تھی۔ قریب ایک فرلانگ پر افس خان وکیل کا بنگلہ بائیں ہاتھ پر تھا اور اُس کے مقابل دائیں ہاتھ پر گلی میں ہمارے دوسرے محترم استاد بیرسٹر خسرو اسحٰق صاحب کا بہت کشادہ مکان تھا اور گلی کے نکڑ پر مشہور درزی نفیس کی دکان تھی۔ بیرسٹر صاحب بہت گراں گوش تھے لیکن بہت محنت سے پڑھاتے تھے۔ وہ حضرت مولانا احمد رضا خان بریلوی علیہ الرحمہ کے قریبی عزیز تھے۔ میرے دوست نامدار خان کی شادی اُنھی کے خاندان میں ہوئی تھی۔ جس سڑک کا ذکر ابھی آیا ہے وہ آگے بڑھتی تھی تو بائیں طرف دوسرے مشہور درزی پرشادی کی دکان تھی اور ذرا آگے داہنی طرف پولس تھانہ تھا۔ پھر آگے بڑھ کر تیسرے مشہور درزی علاءالدین کی دکان تھی اور اس کے آگے چوراہا آتا تھا۔ اُس سے ایک راستہ بالائی قلعہ کو جاتا تھا اور دوسرا راستہ پھول والوں کی طرف ہوتا ہوا جامع مسجد کی طرف جاتا تھا۔

بیرسٹر خواجہ اسحٰق صاحب

اس مسجد سے کچھ آگے ہمارے تیسرے اُستاد بیرسٹر خواجہ اسحٰق صاحب رہتے تھے۔ میں اُن کی خدمت میں بھی حاضر ہُوا ہوں۔ وہ میری اور چودھری عبدالحمید صاحب کی دوستی پر رشک کرتے تھے اور فرماتے تھے کہ تم لوگوں کی دوستی کی طرح میری بھی کسی سے دوستی تھی لیکن اب قریب رہتے ہوئے بھی اُن سے ملاقات نہیں ہوتی۔ بیرسٹر خواجہ اسحٰق صاحب کی ایک بہن امراؤتی (برار) میں تھیں جب کہ میں وہاں کنگ ایڈورڈ کالج میں پڑھاتا تھا۔ محترمہ کے شوہر وہاں کسی بڑے عہدے پر فائز تھے۔ (افسوس کہ اب اُن کا نام یاد نہیں)۔ محترمہ چونکہ میرے استاد کی بہن تھیں اس لیے میں اُن کو پھوپھی کہا کرتا تھا۔ اُن کے امتحان (بی اے) کی تیاری میں بالخصوص فارسی مضمون ان کے مکان پر جا کر پڑھایا کرتا تھا۔ افسوس کہ اب کوئی بھی نہیں رہا۔

؎ خاک میں کیا صورتیں ہوں گی کہ پنہاں ہوگئیں

تمّ